



آنکے پلکوں کی طرح

روح پروردگار ایمان افروز اسلامی تاریخ کی کہانیاں



ناشر
شبیر پبلشرز © ۲۰۰۴ بی اردو بازار لاہور

بھگی پیکوں کا بوجھ

از
ادیب شہیر

حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری

ناشر

شبیر پرائزر۔ ۴۰ بی اردو بازار لاہور

نام کتاب ————— بہیگی پلکون کا بوجہ
 نام مصنف ————— محمد وارث جمال قادری
 نام ناشر ————— شبیر برادرزہ لاہور
 نام کاتب ————— اعجاز احمد ساقی
 تعداد اشاعت ————— چھ سو
 سن اشاعت ————— ۱۹۹۳ء
 نام مطبع ————— بک پرنٹرز لاہور
 ہدیہ ————— روپے

فہرستِ مضامین

- ۱۔ انتساب
- ۲۔ آغا از سخن
- ۳۔ انجمنِ رضا کے مصطفیٰ
- ۴۔ مدنیہ کائنات عشق کی راجدعائی
- ۵۔ مجمع البحرین
- ۶۔ اندازِ مسیحائی
- ۷۔ متھرا کا پندت
- ۸۔ بھنگی پلوں کا بوجہ
- ۹۔ دیوتا کی شکتی
- ۱۰۔ جلوہ رنگین کی تمنا
- ۱۱۔ کفن چور
- ۱۲۔ جہانِ حیرت

ماخذ و مراجع

تاریخ طبری جلد دوم	حضرت امام جعفر ابن جریر الطبری
مکاشفة القلوب	حضرت امام غزالی
تذکرۃ الاولیاء	حضرت فرید الدین عطار
تذکرۃ المحدثین	مولانا غلام رسول فریدی
تحریک آزادی ہندو	پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود ایم اے
السواد الاعظم	پتی اتچا ڈی
سیرال ولیاء	خواجہ امیر خورد
نفحات الانس	علامہ عبد الرحمن جامی
سفینۃ الاولیاء	شہزادہ دارہ شکوہ
حیات الصوفیہ	محمد ادریس انصاری
امیر خسرو	ڈاکٹر وحید مرزا
آب کوثر	پروفیسر محمد اکرم
دلی کے بانیس خواجہ	ظہور الحسن شارب
سوانح حیات شیخ المشائخ	مولانا نسیم بستوی
حکایات شیریں	مدیر محمد آئینہ لاہور
خسر و مشناسی	ڈاکٹر ظ انصاری و ابو الفیض سحر
ریاض الشعراء	علی قسلی خاں یاغستانی

اٹھان سٹخن

زیر نظر کتاب "بھنگی پٹکوں کا بوجھ" میری کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً میں نے اپنی تجارتی مصروفیات سے وقت بچا بچا کر بزبان حکایت لکھے۔ جو بچہ تعالیٰ ملک اور بیرون ملک کے موقر جرائد و رسائل اور ڈائجسٹوں میں شائع ہو کر قارئین سے بے پناہ پسندیدگی کا خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ میں نے کہیں بھی زیب داستان کے لیے ہرگز ہوا میں تیر نہیں چلایا بلکہ جو کچھ تحریر کیا ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر، اپنے ہر مضمون کے لیے میں نے پہلے مضبوط زمین تلاش کیا۔ پھر اس پر خاکے بنائے، پھر اس میں کہاں دلسوزی و دیدہ ریزی سے رنگ بھرے۔ تب جا کر کہیں عشق و محبت، حسن و عقیدت کا یہ سدا بہار گلستانہ تیار ہوا۔ اس طویل مسافت میں کچھ مقام ایسے بھی آئے جہاں پر خود میری پٹکوں پر بار بار آنسو آرز سے بے ساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے دیکھانہ گیا حال فقیرانہ کسی کا کتاب کے آخر میں میں نے مآخذ اور مراجع کی ایک فہرست بھی دیدی ہے۔ جس سے معلوم ہو گا کہ اس گلستانہ نوبہت ساری

لاہ کاری میں کتنے گلستانوں سے گل ریزی کی ہے تب جا کر کہیں صحن
تہا میں محبت کے اس طرح پھول کھلے، عقیدت کے چشمے جاری ہوئے،
اور عشق و وجدان کی لطافتیں نئی لذت سے آشنا ہوئیں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
دردِ دل کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

جب میں نے اسے کتابی شکل دی تو ملک کے موقر کتب خانوں کی طرف سے
اشاعت کی پیشکش ہوئی ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ انجمن
رضائے مصطفیٰ بڑھیا کے زندہ دل جوان بہت جوان حوصلہ ارکان
نے اصرار کر کے مسودہ مجھ سے حاصل کر لیا۔ اس کا راز تو آید و مرداں
چنیں کنند۔ چونکہ اس انجمن کا ایک رکن میں بھی ہوں۔ اس لیے اور
بھی مجھے انجمن کے ارکان کی خواہشوں کا احتیاط کرنا پڑتا ہے۔
مخس ہو رہی ہے۔ اشاعتی محاذ پر یہ انجمن کا پہلا بڑا قدم ہے
موتی عزوجل اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل
انجمن رضائے مصطفیٰ بڑھیا کے ارکان، اس کے علم زردوں، پھی خواہوں
اور اس سے محبت کرنے والوں کو دارین کی خوشیاں عطا فرمائے
اور ان سے اسلام و سنیت کی زیادہ سے زیادہ خدمات لے۔

امین بحبہ سید المرسلین

محمد وارث جمال قادری

۱۱، سوال المکرم ۱۳۰۹ھ

مطابق ۱۶ مئی ۱۹۸۵ء

انجمنِ رضاءِ مصطفیٰ

یہ انجمن دراصل مدرسہ غوثیہ اہل سنت فیض العلوم بڑھیا
کا ایک ذیلی شعبہ ہے جس نے مختصر سی مدت میں عملاقانہ طور پر
مسلمانوں کے اندر دینی بیداری، ملی تڑپ، اور تعلق فی الدین
کی لہر دوڑادی۔ یوں تو مدرسہ غوثیہ کو قائم ہوتے تقریباً پچیس برس
ہوتے ہیں۔ اور اس کے زیر اہتمام ایک انجمن تھی جو اپنی بساط کی
حد تک طلبہ کے اصلاح و تربیت تک محدود تھی۔ پھر اس انجمن کو
اسلام و سنیت کے ہمہ جہت خدمات کے لئے انجمن رضاءِ مصطفیٰ کی
شکل دی گئی۔ جو.....

..... یادگار سلف حجۃ الخلف سید المحققین حضرت مولانا
بدر الدین احمد قادری رضوی کی سرپرستی و نگرانی میں قائم
ہوئی۔ شروع شروع میں فرزند ان مدرسہ غوثیہ مولانا محمد عارف
مولانا سید افرزین نوری، مولانا محمد شمیم قادری، مولانا محمد مستقیم خان
محرم محمد وکیل بھگوت پوری، اور عزیز احمد خان نے بڑا اکیلی رول
ادا کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انجمن کے حسن خدمات نے لوگوں کو اپنا گرویدہ
بنایا۔ اور اب تو پورے کاررواں کاررواں نے انجمن رضاءِ مصطفیٰ
کو اپنے دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں بسایا ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب نزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کاراں بن گیا
 عبد الصمد خاں، مولوی غلام محمد خاں، ابرار احمد دھوبھی، مولانا
 عتیق الرحمن فیضی، محمد مقبول کیتھولیا، زاہد خاں، عدیل خاں،
 برادر م عتیق الرحمن صاحب وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے
 انجمن رضائے مصطفیٰ کو اپنی دینی ضرورت سمجھ کر اس کے وجود کی افلاک
 کو پورے طور پر محسوس کیا۔ اور جب بھی انجمن کو ان کی ضرورت
 پڑی تو انہوں نے اپنا کام کاج چھوڑ کر انجمن کے لیے دن رات ایک کر دیا۔
 فجزاهم اللہ احسن الجزاء۔ انجمن رضائے مصطفیٰ ٹھیکہ کا ایک ٹکڑا
 سال میں ایک بار عظیم پورہ روڈ روڈ دینی ایسٹاس کا انعقاد ہے۔ یہ
 ایسٹاس بڑے تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس موقع
 پر بڑھیا کی سر زمین پر ہر چہ چار جانب سے انسانوں کا سیلاب آتا
 آتا ہے۔ جن کے انتظام و انصرام اور میزبانی کا سارا بوجھ ملحدہ غوثیہ
 کے بجائے انجمن رضائے مصطفیٰ کے جہاں جو ملہ ارکان کے کاندھوں
 پر جوتلا ہے۔ یہ ایسٹاس غالباً دینی اور مذہبی ہوتے ہیں، سیاست
 حاضرہ کی آلودگیوں سے پاک اور مدائنت فی الدین سے کوسوں دور
 اس میں نہ تو سیٹھوں کی قبیلہ خواتی ہوتی ہے اور نہ صلح کیوں
 کی دلجوئی۔ اور نہ ہی بدمذہبوں کی کوئی دروغت۔ اس تاریخی اجلا
 کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں چندہ کا کوئی دھندہ نہیں
 ہوتا۔ اور نہ ہی اس میں کسی بدمذہب کی پذیرائی۔ خواہ وہ دونوی
 طور پر کتنا ہی بڑا صاحب اعزاز کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ فی زمانہ دہمذہب
 میں کے زعم باطل اور اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا بعض معلم

ادارے کا یہی دھندا ہے۔ ان کے جلسے کی غرض وفایت اشاعتِ اسلام
 و سنیت کم حصولِ زرد مقصدِ زریں ہوتی ہے۔
 یاں دعاؤں کی فیس لگتی ہے
 زردے تو زبانِ بلیتی ہے

اس کے لیے ہر وہ راستہ اختیار کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔
 اور اپنے زنجیلِ گدائی کی شکم پُری کے لیے اپنے وقار، عزتِ نفس،
 حرمتِ سنیت، اور امتیازِ حق و باطل، سب داؤں پر لگا دیتے ہیں۔
 مولیٰ عسکر و جنرال اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ
 وسلم کے طفیل ایسے اداروں کے اس آئندہ واربابِ بسط و کشاد
 کی تہنیت فرمائے اور ان کے تسلوب کو عظمتِ اسلام و سنیت
 اور اخلاص فی الدین کے جذبوں سے بھر دے۔
 رکھو غالب مجھے اس کج نوائی سے معاف
 آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

محمد وارث جمال قادری



کارت عاشق کی راہداری

انسانیت جاں بلب تھی اور اس کا پیرہن خون اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کاربنات پر تازیکیاں مسلط تھیں۔ اور وحشت و بربریت کے خونی بگولوں نے اسے ہر طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ گیتی کا فرشتہ تیرہ و تارہ ظلمت کدوں میں بدل کر رہ گیا تھا اور عیسوی روح انسانیت زخموں سے چور تھی، تاریک رات کے مسافر کسی روسطھی کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کاربنات بھر کے بھٹکے ہوئے قافلہوں کو کسی راہنما کی تلاش تھی۔ شام میں یہودی و عیسائی پیشوایان مذہب کی نگاہیں اپنے گرد و پیش سے مایوس ہو کر فلسطین کی وادیوں میں اس نجات دہندہ کی تلاش میں تھیں جس کی آمد کی بشارت ان کے آسمانی صحیفوں میں دی جا چکی تھی، ظلم و ستم، جبر و استبداد کی چمکی میں اپنے والی منطوم سسکتی کرا، تھی انسانیت عدل و انصاف رحم و کرم کے لیے مضطرب تھی۔ درد کی ماری دکھیاری عرب کے باہر کی آبادی کے بہت سے لوگ رحمت ایزدی سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے۔ امن و آسٹی صلح و محبت کے جویاؤں کی پھسرائی ہوئی نگاہیں کسی صبح سعادت کے انتظار میں تھیں۔ مگر جاہل، فدی، مغرور، خونخوار، جفا پیشہ عرب

کا ضمیر ہر طرح کی روشنی سے محروم تھا، اپنے مقدر کے ظلموں کے لیے کسی
 روشنی کی ضرورت ہی نہیں محسوس کر رہے تھے وہ اپنے بدترین ماضی پر
 منتظر اور حال کی بستیوں پر مغرور و مگن تھے۔ ہر وہ شاہراہ جس پر اسلاف
 کے نقش قدم نہ تھے ہرگز قابل قبول نہیں تھے وراثت میں پائی جانے
 والی ہر برائیوں کے امین اور اس کے محافظ تھے ان کا وجود زندگی کی
 بر سعادت کی نفی کرتا تھا۔ وہ اپنے ظلمتکدے کو ہر طرح کی روشنی سے محفوظ
 رکھنا چاہتے تھے مگر یہی وہ ظلمتکدہ تھا جو امن و شانتی اور روشنی کے متلاشیوں کا
 مرکز بننے والا تھا، یہی وہ بجز اور سنگلاخ زمین تھی جسے قدرت نے اپنے احسانا
 و انعامات کی موسلا دھار برسات کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ
 شہب جو جہاں و بربریت، نفرت و حقارت، وحشت و انتقام نسلی قبائلی اور خاندانی عصبیتوں
 کی آماجگاہ تھا۔ معمولی باتوں پر خون کا دھار ا بہا دینے والی زمین جہاں وحشت و بربریت
 کے عفریت انسانی خون اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ امن و سلامتی، رحم و کرم، صلح و
 آشتی، محبت و اخوت کا سب سے بڑا گہوارہ بنے گی۔ نسل در نسل انتقام
 کے شراروں کی جگہ محبت و اخوت کے چشمے اُبلیں گے، فاران کی چوٹیوں
 سے طلوع ہونے والے آفتاب رسالت کی ضیا پاشیوں کے سب سے
 زیادہ مستحق اسی کے در و دیوار ہوں گے، ارض و سما کی ساری نعمتیں
 برکتیں اور سعادتیں اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ سر زمین روئے
 زمین کے بے بسوں بیکسوں، مجبوروں، فلاکت زدوں کی امید بن
 جائے گی۔ اس زمین کے فرش پر بیٹھنے والے مہمیں ایوانوں میں
 رہنے والے کجگلاہوں کے رستموں کا فیصلہ کریں گے۔ جہاں کے
 مکین شکوہ کا قیصر اور سطوت کسریٰ کو اپنے قدموں سے روندیں

گے جہاں کے فرش نشین اللہ کی عظمت و جلال اور اس کی کبریائی و جبروت کا پرچم چہا دانگ عالم میں لہراویں گے۔ وہی شرب جس کا غلغلہ شرق سے غرب، جنوب سے شمال اور فرش سے عرش تک پچا ہوا ہے۔ دنیا کے نقشے تو درکنار خود عرب میں بھی اسے لائق اعتناء نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ جب کفر و شرک، جہالت و بربریت کی دبیز تاریکیوں کو چیرتے ہوئے رسالت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا اور وادی بظاہر نبوت کی ضیا پاشیوں سے تابناک ہوئی۔ اہل مکہ پر مظلوم سسکتی انسانیت کے نجات دہندہ نبی رحمت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت پیش کی تو غریبوں، مسکینوں، مظلوموں، غلاموں، کنیزوں اور چند قابل ذکر نفوس کی ایک قلیل تعداد کے علاوہ اہل مکہ کی اکثریت نے نبی رحمت علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ نہ صرف مسترد بلکہ پیغمبر امن و امان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کے ایسے درپے آزار ہوئی کہ ان پر ان کا عرصہ حیات تنگ کر دیا مسلسل تیرہ برس تک دن رات کی جدوجہد اور جانکاہ مشقت کے باوجود اہل مکہ کا کفر و طغیان، عداوت و دشمنی، تمرد و سرکشی، خباثت و کج روی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شکستہ خاطر کر دیا جس پر انسانیت کے حسن و عظم نے اپنے رب کے حکم سے شرب کو تبلیغ کے لیے مستقل ایک نیامیدن منتخب کیا۔ اپنے رفیقوں اور جاں نثاروں کو پہلے ہی سے اجازت دے رکھی تھی کہ اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مکہ چھوڑ دیں اپنے آبائی وطن کو بے سروسامانی کے عالم میں ہمیشہ کے لیے چھوٹتے وقت ان جاں نثاروں کو جن سبر آزمائشوں سے گزرنا پڑنا۔ اسکی تفصیل

بہت دردناک ہے

یثرب جو ابھی تک عرب کے نقشے پر کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکا تھا۔ مشیتِ ایزدی اس کی ارجبندی کا فیصلہ کر چکی تھی، خاکِ یثرب کو ثریا کا اوج، کہکشاں کا جمال، چاند کی چاندنی، ستاروں کی تابانی، پھولوں کی مہک، غنچوں کا تبسم، کلیوں کا نکھار اور آبشاروں کا ترنم، ملنے والا تھا، صبحِ قیامت تک چہار دانگِ عالم میں اس کی شوکت و عظمت کا فغلہ بلند ہونے والا تھا۔ ابھی یثرب کی مٹی کو خاکِ طیبہ کا خطاب نہیں ملا تھا۔ ابھی اس نے بڑھ کر قدم ناز کا بوسہ نہیں لیا تھا۔ مگر گھر گھر گلی گلی، فرد فرد کی زبان پر یہی تذکرہ تھا کہ جلد ہی خدا کا آخری اور مقدس رسول بیدار بختیوں کی ایک نئی دنیا لے کر ہمارے اندر ہمیشہ کے لیے رونق افروز ہونے والا ہے ہر شخص دیدہ و دل فرایش راہ بنا ہوا ہے۔ ساری آبادی سراپا انتظار ہے۔ خوش بختیوں کی معراج ہونے والی ہے۔ ہر شخص چشمِ تمنا لے ہوئے آرزوں کی بارات سجائے تمناؤں کے ناپید انار و سعتوں میں غوطہ زن ہے۔

خوش نصیب ایک دن ساری آبادی چونک پڑتی ہے۔ دلی خوشگواؤں دھڑکنوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ مسرتوں کا ایک ہیجان انگریز تلام ہے۔ آرزوئے شوق کی گھاگھی ہے۔ ایک شادی کی سی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کسی نے ان کے سوکھے کانوں میں یہ ملکوتی نغمہ گھول دیا ہے۔

« انسانیت کا نجات دہندہ ابوبکر کی رفاقت میں مکہ چھوڑ چکا ہے خفیہ طور

پر چلتے چلائے چھپتے چھپاتے راستہ بدلتے کسی بھی وقت وہ یثرب

میں نزولِ اجمال فرما سکتا ہے ۛ

بس ابھی سے دلوں کا عالم زیر و زبر ہونے لگا۔ افراد اشتیاق اور جذبہ شوق کی گھاگھی میں آبادی آبادی کو چھوڑ چھوڑ کر باہر آجانی کہ کب وہ رحمت و نورا الطاف و کرم اور جمال و جلال کا پیکر مجسم و لنواز تبسم کے ساتھ ہمارے دلوں کے فرش کو عزت بخشے۔ جب سے ان جنم جنم کے پیاسوں نے سنا کہ عزتوں، حرمتوں، عظمتوں، بخششوں، رحمتوں اور ہدایتوں کا چشمہ سیال راستے کے ہر نشہ لب کو سیراب کرتے منزل بہ منزل نہایت تیزی کے ساتھ ہم کو اپنے آغوش رحمت میں لینے کے لیے ہماری ہا طرف بڑھا پڑھا آ رہا ہے ان کی تشنگی دو چاند ہو گئی۔

بالآخر ایک دن رقتوں کا سویرا ہوا گل قدس کی خوشبو آڑی، روح کی بہاروں کا رت بدلی۔ خوش بختیوں کا اجالا ہوا۔ اہل شرب چیخ اٹھے لو! انسانیت کا نجات دہندہ اللہ کا آخری برگزیدہ اور مقدس رسول، بیدار بختیوں اور اقبال مند یوں کا امین بن کر ہم میں جلوہ افروز ہو گیا۔ اب کیا تھا ہر طرف خوشیوں کا چشمہ سیال اُبلنے لگا۔ بہت دستر کے شادیاں بننے لگیں۔ چھوٹے بڑے، نچے بوڑھے، مرد عورت۔ آج کسی کی خوشیوں کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی اچھلنے کودنے لگیں اور معصومانہ لے میں اپنی اپنی دفوں پر خوشیوں کا ساز چھیڑ دیا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَاتِ الْوُدَاعِ

ہم پر چود ہوئی کا چاند ثنیات الوداع (لوگوں کے رخصت کرنیکی جگہ) سے طلوع ہوا

وَجَبَّ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلَّهِ دَاعِ

ہم پر انہر کا شکر واجب ہو گیا جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگتے ہیں۔

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمَطَاعِ

اے وہ ذات گرامی جو ہم میں بھیجی گئی آپ ایسے دین کو لائے جو لائق اطاعت ہے۔

أَنْتَ شَرَّفْتَ الْمَدِينَةَ مَرْحَبًا يَا خَيْرَ دَاعِ

آپ نے مدینے کو شرف و بزرگی بخش دی اے بہترین دعوت دینے والے

تو آپ کے لیے خوش آمدید ہے مرحبا ہے۔

فَلَبِسْنَا ثَوْبَ يَمِينٍ بَعْدَ تَلْقَائِنِ الرَّفَاعِ

پس ہم نے یمنی کپڑے پہنے جبکہ اس سے پہلے یونان کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

فَعَلَيْكَ اللَّهُمَّ صَلَاتِي مَا سَعَى لِلَّهِ سَاعِ

پس آپ پر اللہ عز و جل اس وقت تک تمہیں نازل فرماتا رہے جب تک کوشش

کرنے والے کوشش کرتے ہیں۔

اور پھر اس محسن انسانیت، معلم کائنات آقائے دو جہاں صلی اللہ

تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ وصحبہ وبارک و سلم نے خاکِ شرب کو اپنے قدم

میں منتازوم سے سرفراز فرماتے ہوئے اب تک کے شرب کو ہمیشہ کے لیے

مَدِينَتَا الْمُنَبِيِّ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے بدل دیا اور ارشاد

فرمایا اب آج سے کوئی اسے شرب نہ کہے۔

بلکہ یہ مَدِينَةٌ ہے

اور جب شربِ مدینہ سے بدل گیا تو اس کے لیے عشا قان بارگاہ

رسالت نے کیسی کیسی آرزوں کی بارات سجائی ہے۔ بھگی ہوئی پلکوں

کی چلمن سے ذرا ان آرزوئے شوق کا تماشا تو دیکھیں

یہ نہیں کہ خلد نہ ہو نکودہ نکوئی کی بھی ہے آبرو

مگر اے مدینہ کی آرزو جسے چاہے تو وہ سماں نہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آرزوئے جنت الماویٰ بروں کدو ن زول
جنت میں بس کہ بر خاک دنت ماویٰ کم

(نور اللامعات)

خاکِ طیبہ از دو عالم خوشتر است
لے خاکِ شہرے کدو نے دلبر است

(ذکرا اقبال)

اُن کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے
آنکھوں میں آئیں سر پہ زہیں نہیں مگر کریں

(اعلیٰ حضرت)

طیبہ میں ہر کے سیدھے چلے جاؤ آنکھیں
غامی بھی ہیں چیتے یہ طیبہ ہے زاہد
سیدھی سرگ پہ شہرِ شفاقت ترکی ہے
پھول تو پھول میری آنکھوں میں
مکہ نہیں کہ جاؤں جہاں غیرِ شری ہے
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

(اعلیٰ حضرت)

رک جیتے ہیں جو تیر دے پجاتے ہیں سن
کون کہتا ہے کہ زینتِ ظلم کی اچھی نہیں
جہاں کے فرتے ہیں بوتے ہیں میں زینتِ حور
لیکن لب لبولِ فرقت کوئے ہی اچھی نہیں

(علامہ حسن)

مدینہ کی زمیں بھی کیا زمین معلوم ہوتی ہے
لے آغوش میں عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
تعالیٰ اللہ اے ارضِ مدینہ تیرا کیا کہتا
باندی عرش کی زیر زمیں معلوم ہوتی ہے

رحمۃ اللہ علیہ حضرت علامہ محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی

طیبہ نہ ہی افضل تکتی بڑا زاہد ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی
(اعلیٰ حضرت)

حشر میں خاک بوسے طیبہ کی لے دینا چکا وہ چشم بہرے وہ تون نابت ہوں
(اعلیٰ حضرت)

اس در کی سنوئی ہی عیب کی دوا شہری ہے ہر معاہدی کا طیبہ ہی شفا خانہ
مفقاً اعظم ہند

کسی نے لی زہ کعبہ کوئی گیا سوئے دیر
ہٹے زہ تیرے بندے مگر تیرے دد پر
انیر وقت بہا رہی چلو مندینہ کو
تھار ہو کے مرد تربت پیمبر پر

(کعبہ کی بات)

خریم کعبہ میں بھی یاد آئی طیبہ کی
کہ یادگار حرم میں ہے کو یہ کو تیری
دشت طیبہ ہے یہاں پہل سر کے بل لے اظہلی
مصطفیٰ کا جنتی درد بار تھوڑی دور ہے

(میں اللہ کی طرف سے)

یہ کعبہ ہے یہاں دیوانگی بھی حسن ایماں ہے
اگر طیبہ میں دامن ہاتھ سے چھوٹا تو سب چھوٹا

(بیمبھل)

تلاشش نقش کعبہ پائے مصطفیٰ کی قسم
چنے ہیں آنکھوں سے ذرات خاک کے کونے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

(بیدم وادتی)

نام مدینہ لے لیا چلنے لگی نسیم خلد
سوزش غم کو ہم نے بھی ایسی ہو اچلائی کیوں

(اعلیٰ حضرت بریلوی)

اوپائے نظر ہوش میں آگئے نبی ہے
 آنکھوں سے یہاں چلنا بھی بے ادبی ہے
 مدینہ جاؤں پھر آؤں اور پھر جاؤں
 تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

مسلمان تو مسلمان ہندو و شاعر ابھی مدینہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں عرض کتاں ہیں۔ فکر کی طہارت
 جذبات کی صداقت اور ذوالہانہ عقیدت ملاحظہ ہو۔

(پندرہ روز کا)

(دو ہفت روزہ)

یہ ارض مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
 جنت بھی ہیں مالک جنت بھی ہیں ہے
 اے خاک مدینہ تمہے اعزاز کے صدقے
 جو عرض نشیں ہے وہ یہاں فرش نشیں ہے

(دو ہفت روزہ)

دل محو ہے ہمارا مدینے کی سیر میں
 گھر بیٹھے ہو رہی ہے زیادہ رسول کی

(ہمارا سر کشن پر شاہ
 شاہ جید آبادی)

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی
 شیدا کے محمد ہے وہ شیدا سے مدینہ

(کوشن بھاری
 نور لکھنوی)

یہ ریلوے ٹوٹ اور وحدت نہر حال میں یکساں ہوتا ہے
 جھکتی ہے جس کی کعبہ کی طرف اور دل میں مدینہ ہوتا ہے

(گیش بھاری
 طر)

ذہر رحمت پہ حاضر ہیں شفاعت چاہنے والے
 بڑی حسرت سے امید شفاعت کے آئے ہیں

(کنور ہندو
 بیدی مسر)

جب کبھی جاتے ہیں بل کر سونے طیبہ خوش نصیب
 کارواں کے ساتھ گرد کارواں ہوتا ہوں میں !

میں اگر خاک نشینِ دِراحمِ ہوں گا
 رفعتِ مرثیٰ کے ہمسُرمی بستی ہوگی
 جیسے تیری روضۂ اقدس کو نہ آنکھوں دیکھا
 رُوحِ جنت میں بھی ہوگی تو ترستی ہوگی

_____ (منشی شکر اللہ مٹاق)

جی چاہتا ہے کوپہ انوار میں چسلوں
 اپنے رسولِ پاک کی سرکار میں چسلوں
 _____ (بندت پری کشور شرماتلر)

مجمع البحرین

واوی نیل کے کنارے "طحا" نام کی وہ آبادی جہاں سستروں کے
 اشارے قبضوں کے نغمے بھونتا کرتے تھے۔ عظیم سرخوشی
 میں کیف و مستی کے چشمے ایلتے تھے۔ نورد و نکہت میں ڈوبی فضا میں
 رنگ و آہنگ کی سرمستیاں بحال و رعنائی کی جتا بیاں ہر طرف سے پھوٹی
 موسس ہوتی تھیں آج بہت سوگوار ہے۔ فضاؤں میں بھی حزن و طماں
 اور غم کی ایک چادر سی تی ہے۔ سوگوار کی کیفیت سے ماحول تک پھیل
 ہو گیا ہے۔ ایک طرف کرب آلود سکوت — ایک غناک ساٹنا —
 دریائے نیل کی خاموشی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی بستی والوں کے غم میں
 برابر کا شریک ہے۔

کارگاہ حیات میں زندگی اور موت تو ایک عام سی بات ہے۔
 زندگی کی پھسلی آواز ہی اس بات کی دلیل ہے کہ سزا حیات کے اس
 تار کو ٹوٹنا ہے۔

زندگی کیا ہے عنام میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انھیں بڑا کا پریشان مانا
 زندگی اور موت کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس دنیا میں ہزاروں کی
 تعداد میں لوگ آنکھیں کھولتے، بند کرتے ہیں سے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
 اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جس پر کسی کو حیرت ہے اور تعجب ! کتنے ہی دارا و سکندر آئے اور
چلے گئے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

کتنے ہی مہ دشمنوں، لالہ رخنوں، مہ جلیمنوں، گل بدنوں کا سورج چمکا
دلوں کی وادیاں زیر و زبر ہوئیں، خون کی ندیاں بہیں، ہزاروں گردنیں
کٹیں، خرام ناز کی حشر آفرینی سے ایک عالم تہ و بالا ہوا۔ مگر شہر خروش
میں کسی بھی گوشے میں ڈور ڈورت تک ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

مگر نہیں ! انھیں ہزاروں لاکھوں زندگیاں میں کسی کی موت
اور زندگی ایک ایسا حادثہ بن جاتی ہے کہ جس کی یادوں کے سائے سے
دامن پچانابے مدد شوار ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا حادثہ مد ظہاء نام
کی اس بستی میں محمد بن سلامہ کی بیوی کو بھی پیش آتا ہے۔

بستی کی بڑی بوڑھیاں اور تجربہ کار دایاں اپنی کوششیں کر کے
تھک بار گئیں۔ مسلسل گھنٹوں زندگی اور موت کی کشمکش میں زندگی
کو شکست نصیب ہوئی۔

پھر آج کسی سوچ میں ڈوبے ہیں درو بام

کیا جانے کیا حادثہ بستی میں ہوا ہے

گھر سے باہر تک صاف ماتم بچھ گئی۔ محمد بن سلامہ پر جیسے بجلی گر پڑی جس
شاخ کے سہارے وہ اپنا بیٹھن تعمیر کرنا چاہتا تھا وہ شاخ ہی ٹوٹ گئی۔
مستقبل کے سارے منصوبے ایک خواب پریشاں ہو کر رہ گئے۔
غم زندگی سے اجڑائیں وہ تصویر کی تھلیں کبھی شام غم بھی عزیز تھی مگر اب سو کی تلاش

ہلتے رہے بے بسی! زندگی کے ہر موڑ پر ہر دکھ سکھ کی سائبھی، رفیقہ حیات،
زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو رہی ہے، پاس رہ کر بھی آخری ملاقات
سے محرومی سے

ہائے رے انسان کی مجبوریاں
پاس رہ کر بھی ہیں کتنی دوریاں

جرماں نصیبی کا یہ عالم کہ ارد گرد اظہار تعزیت اور دم دلا سے کہنے
بھی کوئی موجود نہیں۔ اتنا ہوش بھی کسے ہے، کیونکہ بچہ مرنے والی
ماں کے پیٹ کے اندر رہی ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر سوالیہ نشان بنا ہوا
ہے » اب کیا ہوگا « مرنے والے کی کسی عزیزہ نے آنسو بہاتے ہوئے
کہا » ہو گا وہی جو ارحم الراحمین کی مرضی ہوگی۔ ہمارے
دیکھتے دیکھتے ایک زندگی کا چراغ گل ہو گیا اب دوسری زندگی بچانا
ہمارا فرض ہے « ان میں ایک تجربہ کار بڑھیا نے جواب دیا۔ کوشش
اپنا کام نتیجہ رب کے دست قدرت میں! ان آنسوؤں کو صانع کرنے
سے بہتر ہے کہ انھیں اپنے رب کے حضور بہاؤ اور زندگی اور موت کے
مالک سے اس دوسری زندگی کی بھیک مانگو « دوسری زندگی کون
کیا خدمات نے تمہارے دماغ الٹ دیئے ہیں؟ دیکھ نہیں رہی
ہو کہ یہ جرماں نصیب پورے دلوں سے تھی۔ بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں
زندہ ہے خدا سے دعا کرو ہمیں وہ دوسری زندگی بچانے میں کامیاب فرمائے
بڑی احتیاط کے ساتھ ماں کا پیٹ چاک کیا گیا اور کافی بعد و بعد
کے بعد ارد گرد کھڑی عورتوں کو پتے نے بڑی نجف اور کمزور آواز کے

۲۳
ساتھ اپنی زندگی کا احساس دلایا ہے

امید کی مذہم سی اک نو ہو تو پیاری ہے

یہ ایک کرن تہنا ظلمات پہ بھاری ہے

عالم سرخوشی میں ایک ممت عورت باہر نکلی

سلامہ کے بیٹے اب ان سب آنسوؤں کو پونچھ ڈالو، تمھاری

آرزوؤں کی جنت، حاصل تمنا خلد آشیانی شریک حیات نے جاتے

جاتے تمھارے چہرے کی شادابی اور غناک ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی

واپسی کا انتظام کر دیا ہے۔ بڑا خوبصورت اور یادگار تحفہ ایک بیٹے

کی شکل میں چھوڑ گئی ہے جو تمھاری شبستانِ محبت کا ایک خوبصورت

پھول ہے۔

غموں کے ان کر بناک لمحوں میں خوشی کی یہ سوغات بہت حد تک

تمھارے غموں کا مداوا کر سکتی ہے۔ تمھیں یہ مسعود بیٹا مبارک ہو۔

جنت مکانی کے اس امانت کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا کر ماں باپ

دونوں بن کر تمھیں اس کی پرورش کرنا ہے۔ قتلے ذوالجلال تمھیں

مہربیل اور تمھارے حوصلوں کو توانا عطا فرمائے۔

بیوی کو سپردِ خاک کرنے، اپنی تشنہ کام حسرتوں، تمنائوں اور

آرزوؤں پر اپنے ہاتھ سے مٹی ڈالنے کے بعد جب محمد بن سلامہ نے گھر

آکر بیٹے کو گود میں لیا تو اسکی آنکھیں بہنے لگیں! یہ بچہ اپنی ماں کے

گود میں کتنا اچھا لگتا! کاش! اس بد نصیب کو چند ہی لمحوں کا موقع

مل جاتا کہ اسے دیکھ کر اپنی پیاسی آنکھیں سیراب اور کلیجے سے لگا کر

دل کی دھڑکنوں کو سکون دے لیتی ہے

غنچے چُپ ہیں گل ہے ہوا پر کس سے کہئے دل کا حال
 خاک نشیں اک سبزہ ہے سوا پنا بھی بیگانہ بھی
 جب بھی محمد اپنے بیٹے کو اپنی آغوشِ محبت میں لیتا، دل پر ایک چوٹ
 پڑتی۔ جانے کہاں سے بہت سارے درد جاگ اٹھتے۔ یادوں کے قافلے
 جوق در جوق ذہن کے درِ یچوں پر دستک دینے لگتے اور شریکِ حیات کے
 ساتھ بیٹے ہوئے خوشگوار لمحوں کی شکل اختیار کر لیتے
 اپنی سانسوں میں ہے ہر دم تری یادوں کی ملک
 پھر بھلا کیسے تجھے دل سے بھٹلاتے رکھیں
 بچے کی پرورش، سعیِ معاش، فکرِ امروز و اندیشہاے فردا سے چین نہیں
 لینے دیتے، انسانی فطرت کے مطابق شفقتِ پدری سے وہ مالا مال تو
 تھا مگر ماں کا وہ دل پُر اضطراب اور بیقراریاں کہاں سے لانا بونبات بات
 پر اپنے بچے کے لیے تڑپ اٹھتا ہے ع

آج احساس ہوا ہے مجھے تنہائی کا

ماں کی شفقتوں کی ٹھنڈی پھاؤں، مٹا کی بے حسنیوں کی نرم دھوپ
 اور گداز پلکوں کے سائے سے محروم وہ ترماں نصیب پروان چڑھنے لگا۔
 عتد بن سلام بیٹے کا ہر ناز اٹھاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نجوم کی گردش
 نے بچے کو زندگی کے اس اسٹیج تک پہنچا ہی دیا جہاں سے شور و آہی
 کا فریسنہ حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کا قد تو عام بچوں ہی کی طرح تھا مگر ذہنی نشوونما کے معاملے میں
 اپنے گروں سے بہت آگے تھا۔ یہی وجہ تھی کسی ہی میں ابتدائی تعلیم مکمل
 کر کے مشہور زمانہ شافعی فقیہ حضرت شیخ ابراہیم مزنی کے درس گاہ

کے لائق ہو چکا تھا۔

بچپن میں تو تادمبوسس میں لاکھوں فتنے
رفتہ رفتہ تیری رفتاریتامت ہوگی

تیسری صدی کے نصف آخر میں حضرت ابو جعفر احمد بن ابی عمر ان
موسیٰ کی علمی جلالت کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ ان کے علم کی
خوشبو سے ایک عالم مشکبو ہو رہا تھا۔ بھینٹی بھینٹی، پیاری پیاری خوشبو
سے سعید رو میں کیف بار ہو رہی تھیں۔ تشنگانِ علوم کے لیے ان کی
درسگاہ ایک چشمہ سسپال کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ان کے علمی فیض کا
سیلہ دو اہل اس راہ کے ہر تشنہ لب کو سیراب کر رہا ہے۔ ان کی علمی عظمتوں
فکری رفعتوں اور بیکراں ذہنی بلندیوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ کی نسبت

تمذ امام الائمہ، سراج الائمہ، فخر عجم، رشک عرب حضرت ابو حنیفہ النعمان
سے متصل ہے۔ آپ شاگرد ہیں حضرت محمد بن سماعہ کے وہ تلمذ رشید
ہیں قاضی القضاة حضرت امام ابو یوسف کے اور حضرت امام ابو یوسف امام
اعظم ابو حنیفہ کی جلالت علمی، اصابت فکر کے منظر اتم اور آپ کی فقہی عبقریت
کے شاہکار اعظم ہیں۔ اس نسبت کرامت نے آپ کے علمی شکوہ میں چاہا
چاند لگا دینے آتھے۔ جس کی وجہ سے تشنگانِ علوم کا جمگٹا آپ کی
درسگاہ میں سدھنے لگا۔ دور دراز مقام سے طالبانِ شوق کا قافلہ جو قے
درجوق آتا رہتا۔

روایت دیرینہ کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اپنے
اپنے ظرف و حوصلے کے مطابق ہر شخص علم کے اس بیکراں بحر سے اپنا
حصہ لینے میں مصروف ہے علوم و معارف کے وہ خزانے جو اپنے اساتذہ

سے ملے تھے۔ بڑی فیاضی کے ساتھ مستحق باوجود اور اہل تلامذہ کو تقسیم فرما رہے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب، معانی، بلاغت کا آبشار ہر تشنہ کام کو شاد کام کر رہا ہے۔ کہ اسی اثنا دہیں ایک اجنبی نے باریابی کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر بڑے ادب اور قریبے کیساتھ ایک نوخیز لڑکے نے درگاہ میں قدم رکھا۔ آثار مسافرت کے باوجود چہرے پر پڑی دلاویزی تھی، تیکے نقوش، بھیگی ہوئی مسیں، آنکھوں میں ذہانت کی مخصوص چمک بلند اور کشادہ پیشانی سے اقبال مندی کے ہویدا آفتاب سے

بالائے سرش زہوش مندی

می تافت ستارہ بلند می

کا مکمل مصداق تھا۔ چند ساعتوں کے لیے شیخ و تلامذہ کے نگاہوں کا مرکز توجہ بنا رہا۔ سلام و دعا کے بعد حضرت شیخ ابو جعفر نے پوچھا۔
 ” صاحبزادے کہاں سے آ رہے ہو ؟“

” شیخ مزنی کی بارگاہ سے “ آنے والے نے بڑی متانت اور شائستگی سے جواب دیا۔

” کون ! ابراہیم مزنی ؟“

جی ہاں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہو ؟

” بہت اچھی طرح سے وہ شافعی مسلک کے زبردست عالم اور صاحب نسبت بزرگ ہیں ان کے مزاج تو بخیر ہیں “

” الحمد للہ ! وہ ہر طرح سے بخیر و عافیت ہیں۔ البتہ ان کی نظریں میری ہی خیریت خطرے کی زد پر ہے !!“

”ماہی زادے بات کیا ہے؟ کچھ اکھڑے سے نظر آتے ہو؟“
 ”سرکار عالی! بات ہی ایسی ہے۔ آج سے پہلے میں شافعی مسلک پر تھا،
 ”کیا مطلب؟ کیا اب تم شافعی مسلک پر نہیں ہو؟“
 وہی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں شافیت، کو ماموں
 جان کی درسگاہ میں چھوڑ آیا ہوں۔“

”کون مامو جان؟ کیا تم ابو ابراہیم مزنی کے بھانجے ہو؟“
 ”جی ہاں! اس گنہ گار کو ان کا بھانجہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔“
 ”سبحان اللہ! بڑی خوشی ہوئی کہ علی خانوادے کے چشم و چراغ ہو۔ اچھا
 درس ختم ہونے کے بعد تم مجھ سے تفصیلی ملاقات کرنا اور پھر قال اللہ
 وقال الرسول کی حدائے زمزمہ نواز بلند ہونے لگی۔“

درس ختم ہونے کے بعد شیخ ابو جعفر نے کوچہ طلب کے اس نووارد
 کو طلب فرمایا۔ سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے فرمایا: ”بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟“
 ”احمد“

”بہت خوب! میرے ہی ہمنام ہو! مجھ سے پڑھنا کیا چاہتے ہو؟“
 ”فقہ حنفی“

”فقہ شافعی کی تکمیل ہو گئی؟“

”نہیں! ماموں جان کی درسگاہ میں فقہ شافعی ہی کی تکمیل کا ارادہ
 تھا مگر اب میں فقہ حنفی کا عالم بننا چاہتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ میں اس میں
 کمال حاصل کروں۔ حالانکہ ماموں جان یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ بخدا تو
 زندگی بھر فقیہ نہیں بن سکتا۔“

”بیٹے! اب میں تمہارے تبدیلی مسلک کی تفصیل جاننا چاہوں گا اگر

تم مجھے مطمئن کر سکتے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ اپنی درسگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دے دوں گا۔

۱۱ میں اصل واقعہ کی تفصیل گوش گزار کرنے کے لیے خود ہی بے چین ہوں۔ ہوا یوں کہ حسب معمول ناموں جان کا درس جاری تھا کہ اثنائے درس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اگر کوئی حاملہ عورت وضع ولادت سے قبل ہی مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آیا بچے کے ساتھ بچہ بھی دفن کیا جائے گا یا ماں کا شکم چاک کر کے بچہ کو پھیلایا جائے گا۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کا یہ مسلک ہے کہ بچہ کو پھیلانے کے لیے ماں کا شکم چاک نہ کیا جائے بلکہ ماں کے ساتھ بچہ بھی دفن کر یا جائے۔ جبکہ امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ نہیں! اگر واقعی بچہ ماں کے پیٹ میں زندہ ہو تو اس کو پھیلانے کے لیے ماں کا شکم چاک جائے گا۔ اس کو ماں کے ساتھ قبر میں دفن نہیں کیا جائے گا۔

حضرت امام شافعی کے اس مسلک کا حال معلوم کر کے مجھے بڑی وحشت اور سخت صدمہ ہوا۔ میں نے اس مسئلہ پر مسلسل اعتراضات اور شدید اختلاف کیا کہ کیا ایک ایسی جان جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے وجود بخش کر اسے تکمیل فرمایا ہو! یہ اس پر ظلم نہیں؟ اور کیا یہ اس کا قتل ہے نہیں؟ عالم غضب میں میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں ایسے شخص کے مسلک ہی سے راضی نہیں جو میری ہلاکت پر راضی ہو۔ میری ولایت سے قبل میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت امام اعظم کے بے غبار مسلک پر میری والدہ مرحومہ کا شکم چاک کر کے مجھے حیات و عطا کی گئی۔ جبکہ شافعی مسلک

میری بخت مکانی والدہ ماجدہ کے ساتھ میرا بھی فاتحہ پڑھ چکا تھا

وہ آئے ہیں پشیمان لاشیں پر اب

تجھے لے زندگی لاؤں کہاں سے

ماہوں جان فطرت انسانی کے اس جائز مطالبے کو تسلیم کر کے مجھے تسکین
مرحت فرمانے کے بجائے بھڑک اٹھے اٹا بھگلو مور و آلزام قرار دینے لگے اور
قہر و غضب میں ڈلنے لگے۔ موتے فرمانے لگے "ارے گستاخ و بے ادب تیری
جرات کہ اتنے عظیم امام اور صاحب فضل و کمال پر تو یہ اعتراض کرتا ہے جس کی

ذہانت، نقابت اور عقلی جاہ و جلال کا شہرہ اکناف عالم میں پھیلا ہوا ہے
چھوٹا منہ بڑی بات! تو یہ کہ اور حضرت امام کی روح سے معافی مانگے؟

» اس میں توبہ اور معافی کی بات کہاں سے آگئی؟ حضرت امام اور

ان کا علم و فضل، زہد و تقویٰ، عمق و فکر، اصابت فکر، ذہانت و فطانت،
دانش و بینش الغرض تمام تر فضل و کمال کے باوجود وہ ایک فقیہ اور مجتہد

ہیں۔ خطائے اجتہادی کا امکان بہر حال ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کا ہر

اجتہاد درست، ضابط اور قابل قبول ہی ہو جیسے اسی مسئلے کو لے لیں جو

انسانی فطرت سے قطعی میل نہیں رکھتا۔ ویسے ان کی حسن نیت اور اجتہاد

کوششوں میں اگرچہ خطائے اجتہادی ہی کیوں نہ ہو اس کا اجر عظیم ان

کے لب کے یہاں تو محفوظ ہی ہے۔

» اسے نالائق اگر تیری یہی کٹ جتی رہ گئی تو تو پڑھ چکا اور بن چکا

فقیہ۔ اپنے ذہن و فکر کی اصلاح کر نہیں تو بخدا تو زندگی بھر فقیہ نہیں بن سکتا۔

» فقہ شافعی سے مجھے کوئی کہ نہیں ہے۔ حضرت امام شافعی کی سیرا

شخصیت کے احترام سے آج بھی خانہ دل معمور ہے امت مسلمہ پر ان کے

بے پایاں احسانات ہیں۔ اربابِ علم و فن کی فہرست میں ان کی عظیم شخصیت اپنے پورے وقار کے ساتھ موجود ہے۔

مگر اس مسئلے میں مجھے دنیا کی کوئی طاقت، کوئی دلیل، کوئی برہان، مطمئن نہیں کر سکتی۔ میں اس تانگ ترین مسئلے میں بے حد جذباتی ہو گیا ہوں جو اب عرض کر دیا کہ مجھے ایسی نقاہت اور ایسا مسلک نہیں چاہئے جس میں ہم جیسے سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں آج ہی سے شافعی مسلک سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے سلام عرض کیا اور کھینگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان کی درگاہ سے نکل آیا۔

دردِ یوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بڑی شہرت سن کر حضور والا کی بارگاہِ کرم میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے رتہ و الرتہ والیوں کے حلقہٴ اطاعت میں شامل ہونے کے لیے حاضر ہو گیا ہوں مجھے اپنے قدموں میں جگہ عطا فرما کر میرے عالی دامن کو علوم و ادب کی مخصوص فقہ حنفی کے خزانے سے بھر دیں۔

اس لڑکے کی سرگذشت سے شیخ جعفر کافی متاثر ہوئے۔ پر شفقت

لہجے میں فرمایا: بیٹے میرے پاس علم کا جو بھی تھوڑا بہت سرمایہ ہے اسے سپرد کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ یہ تو تمہاری اپنی صلاحیتوں، مقصد سے وابہانہ لگاؤ اور سچی تربیت پر منحصر ہے کہ تم مجھ سے کتنا کچھ حاصل کر سکتے ہو۔ ویسے مجھے کچھ اندازہ ہو چکا ہے کہ میں تمہاری منزل کی ابتداء تو ہوں مگر انتہا نہیں۔ جاؤ تم خوب محنت کرو۔ مولائے غر و حیل تمہیں اپنے نیک مقصد میں کامیاب و بامراد فرمائے، اگر دش سیل و نہار اور زمانے کے اٹا پھر

میں اس لڑکے کا علمی سفر جاری رہا۔ بتدریج ذہنی ارتقاء کی ان بلندیوں تک پہنچ گیا جن تک اُس کے ہم عصر صرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے اور بس! فطری ذہانت، وہی فیضانِ اولیٰ شیخ جعفر کی خصوصی توجہ کی بدولت وہ آپ کی درسگاہ کا لاسا ہیرا ثابت ہوا جسکی شعاؤں سے ہم سب کو دروہام جگمگانے لگے۔

تَفَقَّهٌ فِي الدِّينِ۔ میں کمالات کی منزل جوں جوں قریب آنے لگی اس کی تشنگی بڑھتی گئی اس کے دل و دماغ میں علم و یقین کا اجالا جیسے جیسے پھیلنا لگا۔

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور

اس کو پھیلی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

بالآخر وارفتگی شوق نے اتنا مجبور کیا کہ ایک دن انتہائی شفیق و مہربان استاد کی اجازت سے مصر چھوڑ دیا۔

میں کہاں رکلا ہوں عرش و فرش کی آواز سے

مچھل جاتا ہے بہت ادنیٰ چاند پر آواز سے

مصر کی وحشتوں، راستے کی جان لیوا کلفتوں، اور سفر کی صعوبتوں کو روندتے ہوئے ایک صبح اس نے "شام" کی سرزمین پر قدم رکھا۔

مصر ہی میں اُس نے وقت کے بے مثل فقیہ اور ملکِ شام کے قاضی

القضاة (چیف جسٹس) حضرت ابو حازم کی اعلیٰ درجہ فقہیت کا چرچہ

سن رکھا تھا۔ آرزوئے شوق نے کشاں کشاں اُن کی چوکھٹ تک پہنچا دیا

قاضی القضاة سے تفصیلی ملاقات کے بعد اسے یقین ہو چلا کہ اب تَفَقَّهٌ فِي الدِّينِ

کے سلسلے میں یہی میسر ہی آخری منزل ہو گی چنانچہ یہی ہوا۔ اس کی

ذہانت، ذکاوت، فقہ حنفی سے فالہانہ نگاہ اور سہ پناہ وابستگی دیکھ کر شیخ ابو حازم کو اس پر پیرایا گیا۔ اور ایسی خصوصی توجہ فرمائی کہ وہ اپنے وقت کے فقیہوں کا سر تاج بن گیا۔

میدانِ فقہ میں اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھا دینے کے بعد فقہ ہی کی طرح حدیث کو بھی اپنا خصوصی میدان منتخب کیا۔ اور اس نازک اور دشوار ترین سفر میں جتنے بھی ائمہ، فن، مشائخ وقت اور محدثین زمانہ ملے ان سب کا استفادہ اور اکتسابِ فیض کیا بن کی طویل صحبتوں کے فیضان نے اسے فقیہ و مجتہد کے ساتھ ہی ساتھ نہ صرف ایک عظیم محدث بلکہ حافظُ الحدیث بنا دیا۔

حضرت سلیمان بن شعب کیسانی، ابو موسیٰ صدیقی، ہارون بن سعد یونس بن برد اعلیٰ، ہارون بن سعید اعلیٰ، ابراہیم بن ابوداؤد، بکار بن قتیبہ، عبد النعمیٰ بن رفاعہ، محمد بن سعید اعلیٰ وغیر ہم جیسے ائمہ فن اور محدثین زمانہ کا شمار اس کے اساتذہ کی فہرست میں ہوتا ہے۔

اب محمد بن سلام کے پیٹھے احمد کی شہرت اور اس کے علمی فضل و کمال کا آوازہ دور دور تک پہنچ چکا ہے۔ عالمِ اسلام میں اس کی علمی صلاحیت و مرتبت کا شہرہ تیزی کے ساتھ پھیلا جا رہا ہے۔ ہر طرف سے طالبانِ شوق کا قافلہ چلا آرہا ہے۔ اس کی مستند علم و فضل طالبانِ علوم و فنون کے لیے مرکزِ نجوم آرزو بن چکی ہے۔ بتدریج وہ عالمِ اسلام کا مرکزِ عقیدت بنتا گیا۔ بڑے بڑے کھلا ہوں کی گردنیں اس کے علمی وقار و جذبے کے آگے جھک گئیں۔ آج فقہاء و محدثین کی طویل فہرست میں اس کے تلامذہ کے نام جنتِ نگاہ بنے ہوئے ہیں۔

عالم اسلام نے بڑے احترام اور عقیدت و محبت کے ساتھ محمد بن سلام
 کے بیٹے انس کو حضرت امام طحاوی کے لقب سے یاد کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 ہزاروں سال زکریا اپنی بے نوری پہ روتی ہے
 بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دید و پید

امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلام تیسری صدی ہجری کے ایک عظیم محدث اور مشہور
 فقیہ تھے۔ فقہاء و محدثین کے طبقات میں ان کا شمار یکساں ہوتا ہے۔
 سلف صالحین اور علماء متقدمین میں ایسی شخصیتیں نایابی کی حد تک کیاب
 ہیں کہ جن کا شمار فقہاء و محدثین میں یکساں ہوتا ہو۔ گویا آپ کی کوہ پیک
 شخصیت اساتین امت میں مجمع البحرین کی حیثیت رکھتی ہے۔
 کیا حسن ہے: جمال ہے، کیا رنگ و روپ ہے
 وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تہا دکھائی دے

محدثین آپ کو حافظ اور امام کہتے ہیں زیادہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح
 میں حافظ اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کو ایک لاکھ حدیثیں متناہو
 سند اور اس کے راویوں کے احوال برجا و تعدیلاً یاد ہوں، اور
 فقہائے عظام نے آپ کو مذہب حنفی کا ایک عظیم مجتہد مانا ہے۔

علم و فضل ہی کی طرح آپ صاحب زہد و تقویٰ بھی تھے۔ عوام
 سے لے کر خواص تک احترام و عقیدت سے آپ کے حضور خمیدہ سر تھے
 آپ بڑے بیباک نڈر اور حق گو تھے۔ تاج کی پروا کئے بغیر کلمہ حق کا
 اظہار بزملا فرماتے اور بڑی سختی کے ساتھ اس پر قائم بھی رہتے۔
 آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
 اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

حضرت امام ابو جعفر طحاوی کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ہر دور میں مورخین اور سیرت نگاروں نے آپ کے حضور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، کلام، تاریخ رجال وغیرہ پر آپ نے کثیر اور معسرکہ الآثار التصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یوں تو آپ کی تمام کتابیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں مگر ان تمام عظیم الشان علمی شاہکاروں میں ”شرح معارف الآثار“ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلک حنفی تو الگ رہا۔ کسی بھی مسلک میں اس کتاب کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی ہے جس حسن و خوبی اور ذہانت کے ساتھ حدیث، فقہ رجال کے متعدد علوم کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ وہ صرف امام ابو جعفر طحاوی ہی کا حصہ ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تانه بخش خدا سے بخشندہ

امام طحاوی کو اس کتاب لکھنے کا مقصد صرف احادیث جمع کرنا نہیں بلکہ ان کو یہ ثابت کرنا تھا کہ مسائل شرعیہ میں رشک عرب، فخر عجم، امام الائمہ، سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عظیم موقف احادیث کے خلاف نہیں جیسا کہ تنگ دل خاسدین بے فہم مسکین خصوصاً ماہنی و حال کے وہابیہ غیر مقلدین کا پڑیگندہ ہے، اور اگر بظاہر کوئی حدیث امام اعظم کے مسلک کے خلاف نظر آتی ہے۔ تو وہ مؤول ہے یا منسوخ (جس سے قطعاً بے خبر ہیں حدیث دان کے یہ دعویٰ دار بالشتے یوقون)

اس عظیم کتاب میں حضرت امام طحاوی کا علمی شکوہ پور جاہ و جلال

کے ساتھ نظر آتا ہے۔ کہیں احادیث پر فنی گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
تو کہیں مخالفین کے پیش کردہ روایات پر جرح کرتے ہوئے اسماء الرجال
کا دفتر گراں بار لئے دکھائی دے رہے ہیں اور کہیں کہیں پر تو ان کے
موقف کا عقلی طور پر پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے دلائل و براہین سے ان کے
موقف کے تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب
روایت و درایت کا شاہکار اعظم ہے۔

حضرت مہا قضا امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ۳۳۹ھ میں پیدا ہوئے اور
بیاسی سال کی قابل رشک زندگی گزار کر رحمۃ اللہ علیہ ۳۲۲ھ میں واصل بحق ہوئے۔

ساہبا در کعبہ و بت خانہ می تالذ حیات
تاز بزم عشق اک دانائے ناز آید بزم

انداز مسیحائی

زُلف بنگال، چشم بنگال، سحر بنگال کے تہا تر حشر آفرینیوں کے باوجود سلطان غیاث الدین بلبن کا قیاض بہ سادہ اور اولوالعزم بیٹا بفر اٹال اپنی زندگی کی مشکل ترین ہم سے سرخرو ہو کر جشن فتح بنگال منارہا تھا۔ ہر طرف سے تحسین و مرجبا، مبارک و سلامت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ دربار کا شعرا اس عظیم الشان فتح پر ایک سے بڑھ کر ایک فحشائے اور قصیدے پیش کر رہے تھے۔ فراخ دل، عالیٰ وصال اور قیاض شاہزادہ بھی فیض عطا کا پسیر مجسم بنا ہوا تھا۔ اور جب طوطی ہند، خاقانی زماں، بیل خوشنوا شہر و نے منفرد لہجہ میں اپنا قصیدہ پیش کیا تو رنگ و آہنگ کا موسم بدل گیا اور پڑھنے والوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا قصیدہ لپیٹ کر بیٹھیں ڈال دیا۔

پھر اس کے بعد چراغوں کی روشنی نہ رہی

تو پھر شہزادے نے بھی جو وہ سخا کی تاریخ میں ایک جلی عنوان کا اضافہ کرتے ہوئے حضرت امیر خسرو کو پانچ لاکھ تنکے عطا کئے۔ امیر خسرو اس گرفت دار انعام کو پتھروں پہ بار کر کے شاہی لشکر کے ہمراہ دلی واپس ہوئے۔

شاہی لشکر دلی کی طرف رواں دواں تھا۔ منزل مقصود کا قاصد قریب قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے والدین، بیوی بچوں سے جلد تر ملاقات کے شوق میں فوج زمین کی طنائیں سمیٹ رہی تھی۔

رات اپنا سیاہ بازو پھیلاتے کابرات کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے دو سکرپیر میں داخل ہونے والی تھی کہ اچانک ایک سرائے سے گئے ہوئے امیر خسرو نے اپنے گھوڑے کی بانگ کھینچ لی۔ آپ کے رکتے ہی پیچھے رواں دواں لشکر رک گیا منزل کی طرف تیزی سے بڑھتے کارواں کے اچانک رگ جانے سے فوج میں فطری اضطراب ہوا۔ آپ کے پیچھے چلنے والے ایک فوجی نے ادب کے ساتھ دریافت کیا: حضور! آپ نے سواری کو کورے روک لیا؟

» آہ! تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہے؟

» کچھ بھی نہیں۔

» بوئے شیخ می آید۔ (پیر کی خوشبو آرہی ہے)

» بوئے شیخ؟

» ہاں ہاں بوئے شیخ، مرشد کابل کی خوشبو۔

» حضور والا بدلتی تو ابھی بہت دور ہے۔

جانے کتنی میل دور! اتنی دور سے بوئے شیخ کا کیا مطلب ہے؟

» اسے بھائی بوئے شیخ کا مطلب بوئے شیخ ہی ہوتا ہے، یہ کہہ کر

اضطرار اپنی کیفیت میں گھوڑے سے اتر پڑے۔ وارفتگی شوق میں سرانے

کی طرف لپکے جہاں سے بوئے شیخ آ رہی تھی۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر مطمئن کرنا چاہا۔

» حضور والا! اس سرانے سے بوئے شیخ کا کیا واسطہ ہے؟

آپ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

تجھے کیا معلوم ہوئے شیخ کیا ہوتی ہے؟

تو نے تو کر دیا طیب آتش سینه کا علاج

آج کی درد آہ میں بوئے کباب آئی کیوں

میرے بھائی اگر بوئے شیخ اس طرف سے نہیں آئی تو خسو کی مشام با

مضطربے خود کیوں ہوئی۔ ہونہ ہو اس سرائے میں کوئی خاص بات ضرور ہے

سے ارد گرد کے ماحول کو عطر بیز کر رکھا ہے وہ

کپے کپے میں ہسکتی ہے یہاں بوئے قیص

یوسف تال ہے ہر گوشہ کنتان حسب

رات بھیگ چکی تھی۔ سیاہ شب کی ذائقیں بکھری تھیں۔ مسافر تین دن کی

میٹھی آغوش میں پہنچ چکے تھے اللہ سرتے کا مالک جاگ رہا تھا۔

فوجیوں کی مسلسل دستک پر اس نے درد آزدہ کھولا۔ جوں ہی ٹکر

پڑی جو اس بانہ ہو گیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چہرے کا رنگ ڈگڑگیا

آواز میں گویا ہوا۔ سرکار ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے کوئی جرم سرزد ہوا۔

جانے اٹھانے میں کوئی بھول ہوئی ہے

ارے نہیں بھائی! تم سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ گھبرانے کی

کوئی بات نہیں۔ ہم چند مسافروں کو دیکھتا چاہتے ہیں بس یہ

جوں ہی یہاں تک کھلا، امیر خسرو بے تابانہ اندر داخل ہوئے سنانے

ہی ایک خستہ حال مسافر بڑی بوز میں پر بے خبر سو رہا تھا۔ اسکی

طرف سے بوئے شیخ آ رہی تھی جس نے خسرو کے سوزدروں کو دوچند کر دیا۔

تھامے دل میں جو چوٹ تھی دہی ہائے غضب ابھر گئی

پوچھو تو آہ سو بے ٹھنڈی ہوا چلائی کیوں

آپنی بڑی آہستگی سے اُسے جگایا۔ آنکھیں کھولنے پر لہنے چاروں

طرف فوجیوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ تو اس باختگی کے عالم میں قبل اس کے کہ وہ بھی سرائے کے مالک کی طرح اپنی صفائی پیش کرتا۔ حضرت امیر نے اسے انتہائی نرم شیریں، لطیف اور کریمانہ لہجے میں مخاطب فرمایا۔
 ”بھائی ہم تمہاری نیند میں خلل انداز ہوئے، معذرت چاہتے ہیں۔ دل نیاز پیشہ کے اضطراب مسلسل نے مجبور کر دیا۔ اچھا یہ بتاؤ تم کہاں سے آرہے ہو؟“

”حضور والا ہم دہلی سے آرہے ہیں!“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم دہلی میں بادشاہ دین و دنیا، سلطان المشائخ محبوب الہی سرکار نظام الدین اولیاء کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہو گئے تھے تمہیں ان کی زیارت نصیب ہوئی تھی؟“

”جی ہاں، خاص کر ہم انہیں کی خدمت عالی میں ایک بڑا مقصد لے کر بڑی امیدوں کیساتھ حاضر ہوئے تھے۔ ان کی چارہ سازئی و دروندی، عمدہ نوازی، کرم فرمائی، دستگیری اور اندازِ مسیحائی کا بڑا شہرہ سنکر۔ مگر اپنی زنگ آلود، مقفل قسمت کی کنجی وہاں بھی نہیں ملی۔“

”بارے وقت کی بے بہری، جس کی فیض و عطا، داد و ہش کا شہرہ یہ صغیر بحر میں پھیلا ہوا ہے، وہاں سے بھی خالی ہاتھ واپس ہو رہا ہوں سے“

”اُمید بھی اب ٹوٹی راستہ ہے نہ منزل ہے“

”ایسا ہو نہیں سکتا کہ ان کی بارگاہِ فیض و عطا سے کوئی ہاتھ خالی جائے۔ بالخصوص تم جیسا خستہ حال، غریب الدیار آدمی، اپنی

طرف فوجیوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ تو اس باختگی کے عالم میں قبل اس کے کہ وہ بھی سرائے کے مالک کی طرح اپنی صفائی پیش کرتا۔ حضرت امیر نے اسے انتہائی نرم شیریں، لطیف اور کریمانہ لہجے میں مخاطب فرمایا۔
 ”بھائی ہم تمہاری نیند میں خلل انداز ہوئے، معذرت چاہتے ہیں۔ دل نیاز پیشہ کے اضطراب مسلسل نے مجبور کر دیا۔ اچھا یہ بتاؤ تم کہاں سے آرہے ہو؟“

”حضور والا ہم دہلی سے آرہے ہیں!“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم دہلی میں بادشاہ دین و دنیا، سلطان المشائخ محبوب الہی سرکار نظام الدین اولیاء کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہو گئے تھے تمہیں ان کی زیارت نصیب ہوئی تھی؟“

”جی ہاں، خاص کر ہم انہیں کی خدمت عالی میں ایک بڑا مقصد لے کر بڑی امیدوں کیساتھ حاضر ہوئے تھے۔ ان کی چارہ سازئی و دروندی، عمدہ نوازی، کرم فرمائی، دستگیری اور اندازِ مسیحائی کا بڑا شہرہ سنکر۔ مگر اپنی زنگ آلود، مقفل قسمت کی کنجی وہاں بھی نہیں ملی۔“

”بارے وقت کی بے بہری، جس کی فیض و عطا، داد و ہش کا شہرہ یہ صغیر بحر میں پھیلا ہوا ہے، وہاں سے بھی خالی ہاتھ واپس ہو رہا ہوں سے“

”اُمید بھی اب ٹوٹی راستہ ہے نہ منزل ہے“

”ایسا ہو نہیں سکتا کہ ان کی بارگاہِ فیض و عطا سے کوئی ہاتھ خالی جائے۔ بالخصوص تم جیسا خستہ حال، غریب الدیار آدمی، اپنی

پریشانی، خستہ حالی اور ضرورت کیسا کہ صورت واقعہ کی پوری تفصیل
بیان کرو۔

” حضور والا! میں ایک پریشاں حال اور بے حد غریب آدمی ہوں
حالات کی کڑی دھوپ نے مجھ سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ غریب اور بھی
دنیا میں ہوں گے مگر معاشی بد حالی نے مستقل مجھ سے دوستی کر لی ہے
زندگی کی گاڑی جیسے تیسے کھینچ کھانچ کر عمر کی اس منزل تک لے آیا۔ میری
حرماں نصیبی یہی نہیں کہ غربت نے مستقل میرے گھر پر ڈیرا ڈال رکھا ہے
مزید برآں اس جان ناکو اوں پر جوانی کی پرخطر دہلیز تک تلے اوپر پہنچنے
والی سات جو اینیوں کا بوجھ بھی ہے۔ ہم نے اب تک بڑے غم برداشت
کئے۔ صدقات جھیلے، دکھ کے بوجھ اٹھائے جو میری کر بناک مامنی کا
ایک حصہ ہیں۔ مگر سات جو اینیوں کے بوجھ سے ابھی سے لرزہ براندام ہوں۔
میرا سکون غارت ہو چکا ہے۔ میری تمنا تھی کہ میں اپنی بچیوں کی شادی سے
سبکدوش ہو جاؤں مگر مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ میں اپنی ایک بی لڑکی کو
اس کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت سے ہمکنار کر سکوں۔

غموں کی دھوپ میں کاٹا ہے زندگی کا سفر

کہ راستے میں کوئی نخل سایہ ڈال نہ تھا

انہیں ناتمام حسرتوں کو لیکر میں سلطان الاولیاء سرکار محبوب الہی کی
بارگاہ بندہ نواز میں حاضر ہوا۔ اپنی ذراستان الم گوش گزار کی جیسے سنکر
آپ کی پلکیں نم آلود ہو گئیں، تسلی کے کلمات خیر سے مجھے تسکین فرمائی اور
ارشاد فرمایا کچھ دن میرے پاس رہ جاؤ، خدائے ذوالجلال بہتری کی کوئی صورت
پیدا کرے گا۔

چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق میں آپ کے قدموں میں رہنے لگا۔ اس امید
توی پر کہ یہاں تو ہر طرف سے فتوحات کا سیلاب آتا ہے جس سے خلق خدا سیراب
ہوتی ہے۔ میزری بھی بگڑی کسی دن بن جائے گی۔ مگر ہائے رے برگشتگی
تقدیر! جس دن سے میرے منحوس قدم وہاں پڑے کہیں سے کوئی چیز آپکی
بارگاہ میں آتی ہی نہیں کہ جس سے میرے درد کا درماں ہوتا۔

کچھ دن انتظار کے بعد بالآخر میں نے رخصت کی اجازت چاہی تو آپ
تڑپ لٹھے۔ ندامت بھرے انداز میں فرمانے لگے "اس فقیر بڑی امیدیں
وابستہ کرنے والے ہمان! میں تم سے شرمندہ ہوں کہ فی الحال میں تمہارے
کوئی خدمت نہ کر سکا اور حق میزبانی ادا نہ ہو سکا۔ بروقت تمہیں دینے کے
لیے کچھ نہیں ہے۔ البتہ ایک جوڑی پرائی جوتی ہے جو میری اپنی ملکیت ہے۔
اگر تم اسے قبول کر لو تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کہ تم میرے یہاں سے بالکل
خالی ہاتھ نہیں گئے۔"

اسے میں نے اپنا نصیب سمجھ کر لے لیا اور وہاں سے چل پڑا۔
امیر و غریب، رئیس و فقیر، شاہ و گدا کو نوازنے والی بارگاہ سے
اپنی محرومی پر میں سخت ادا اس و غمزدہ ہوں۔ اپنی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ
لیکر میں بادشاہ دین و دنیا کے پاس حاضر ہوا تھا۔ اُن کی بارگاہ فیض و عطا
سے ایک پرائی جوتی ملی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب میرے مسئلے کا حل
کیا ہوگا۔ میرے نصیب کی در بدری کب ختم ہوگی؟" سے
ہمائے گھر کی دیواروں پہ نا بستر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے
امیر خسرو نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "دوستو! کیا میں

نہیں کہتا تھا کہ اس سرائے میں مزدور کوئی خاص بات ہے جسے خسرو کے پاؤں
میں زنجیر ڈال دی ہے ؟

”ابھی مسافر! کیا تم اس مقدس نعلین کو جو سلطان المشایخ محبوب الہی
سید نظام الدین عثمانی نے تمہیں اپنے کمر سے عطا فرمائی ہے، میرا تمہارا
فروخت کرنا پسند کرو گے؟“

سوال سے زیادہ لہجہ عجیب تھا۔ وہ چکر کے رہ گیا۔ ایک ایسا شخص
جو فوجی ہتھیاروں میں نمایاں، ممتاز اور منفرد و معزز نظر آ رہا تھا۔ فوجی جس کے
سامنے مؤدب اور وہ خود ان کی نگاہوں میں محترم تھا! اس کے وہم و گمان
میں بھی نہیں تھا کہ اس پرانی جوتی کو جو چلتے وقت سلطان المشایخ نے
اسے عطا فرمائی تھی جس کے بارے میں ابھی تک وہ خود سنجیدہ نہیں ہو سکا
تھا اس کو خریدنے کے لیے کوئی سوچے گا بھی!! جبکہ یہاں ایک بڑا محترم
انسان اس کے خرید و فروخت کی بات بھی کر رہا ہے۔ ابھی وہ سوچ کے دائرے
سے باہر نہیں نکل سکا تھا کہ امیر خسرو کی دوبارہ آواز ابھری۔

خوش نصیب انسان! تم نے کیا نہیں کہ اس قابل احترام جوتی کا
تم کیا لو گے؟“

دوبارہ مخاطب کرنے پر وہ ہلکا ہلکا۔ آپ مذاق تو نہیں فرما رہے ہیں؟
بھلا آپ جیسا معزز آدمی پرانی جوتی کو لیکر گیا کرے گا؟ کسی بادشاہ یا شہزادے
کی بھی نہیں کہ اس کے نقش و نگار میں کچھ سونے چاندی کی زری نکل آئے
ایک دنیا بیزار درویش کی جوتی اتنی اہمیت تو نہیں رکھتی کہ آپ جیسا معزز
انسان اس کو خریدنے کی بات کرے۔ اگر کسی طرح کا یہ انداز ستم ہے تو
دکھوں کے ڈھیر میں ایک ہلکا اضافہ یہ بھی سہی کہ سہ

تن بعد ذراع داغ شد پنبہ کجا کجا نہسم

استغفر اللہ معاذ اللہ تمہیں کسی طرح کی تکلیف پہنچانا یا مذاق اڑانا میں
گناہ سمجھتا ہوں۔ آخر تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں اپنی پیشکش میں مخلص
ہوں۔ ویسے کوئی زور زبردستی نہیں، صرف گزارش ہے کہ وہ مقدس نعلین کو
قیمتاً دیدو جو بھی مناسب قیمت تم کہو گے میں دینے کو تیار ہوں آپ کے
تین دو سبزی وہ بولجے سے اسے یقین ہو چلا کہ مجھ سے مذاق نہیں کیا جانا
ہے۔ بڑی مشکل سے اس کے جھکے، صرف اتنا کہ سگاہ اس محترم انسان کی نعلین
کی قدر و قیمت کا مجھے اندازہ نہیں۔ آپ جو بھی عطا فرمائیں گے ہم اُسے
شکر کے ساتھ قبول کر لیں گے۔

سر دست میرے پاس صرف پانچ لاکھ تنگے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں
کہ تمہاری لکھی طرح میں بھی حالت سفر میں ہوں۔ اس حقیر اور معمولی رقم کے
عرض اگر مجھے تم وہ قیمتی اور مقدس نعلین دے دو تو ہم تمہارے شکر گزار
ہوں گے۔ آپ جذبہ شوق میں بولے جا رہے تھے اور اس پاس کے لوگ
عالم حیرت میں دم بخود۔ خود مسافر پر تو حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

امیر خسرو نے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ اس سلسلے میں جو کچھ
میں کہہ رہا ہوں اس میں کذب یا مذاق کا شائبہ تک نہیں ہے۔
دو عالم سے کرتی ہے یگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

حیرت کا طلسم ٹوٹنے پر مسافر نے عرض کیا «حضور والا! اگر آپ
اپنی اس پیشکش میں مخلص ہیں جبکہ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں تمہاری
یہ طرح مسافر ہوں تو اتنی بڑی رقم آپ حالت سفر میں کہاں لائیں گے؟»

” سب کچھ میرے پاس لکھیں ہے۔ پانچ لاکھ تنکے خچروں پر لدے
ہیں جو سرائے کے باہر کھڑے ہیں۔ یہ مقدس جوتی ہیں دے دو۔ اس کے
بدلے میں یہ دولت گھر لے جاؤ۔ بچپوں کی شادی کشادہ دستی سے کرواؤ
اپنی زندگی بھر کی عمر میوں کا ازالہ کرو۔“

مسافر تیزی کے ساتھ سرائے سے باہر نکلا اور بڑی بے یقینی کے
عالم میں خچروں پر لدی دولت کو دیکھنے لگا۔ جاگتی آنکھوں سے وہ خواہ
نہیں بلکہ زندگی کی ایک خوبصورت حقیقت دیکھ رہا تھا۔
”اب تو تمہیں یقین آگیا۔ جلدی ہو لو کیا کہتے ہو؟“

”حضور عالی! اب مجھے یقین آگیا۔ مگر میں یہ دولت کیسے
لے جا سکتا ہوں؟ راستے میں چور، لیٹھے، ڈاکو طیں گے، تنہا ایک
میری جان، مال الگ لوٹ لیں گے، جان الگ جائیگی۔ میں پھر اسی
طرح کنگال کنگال رہ جاؤں گا۔“

”فوج کی حفاظت میں دولت تمہارے گھر پہنچا دی جائے گی۔
بس اب تو مطمئن ہو۔ اب لاؤ جلدی کرو۔“

اس مفلوک الحال ’غریب الدیار‘ اجنبی مسافر نے بھیگی پلکوں کے
نجات مقدس نعلین کو چومتے ہوئے پیر غسر کو پیش کیا۔ پھر گویا آواز میں
کنے لگا ”دلی پہنچ کر بادشاہ دین و دنیا، شہنشاہ فیض و عطا سے
دست بستہ سلام کہیں، واپسی پر راستے میں بدگمان بھی کہی ہو جا یا
کرتا تھا کہ پیر سنگین مسائل کا حل کیا یہی پرانی جوتی ہے؟ غلام بہت
شرمندہ ہے۔ میری طرف سے معافی ہی مانگ لیں۔ ہم جیسے کم نگاہ اور
فہر میں اس ابتدا از مسیحائی کو کیا سمجھیں۔ جو دوستی، فیض

و عطا کے بادشاہ کا اندازِ بخشش و عطا ہم گداگروں کے فہم و ادراک سے
بہت ماورا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

آپ نے اس اجنبی مسافر سے پیرومرشد کے مقدس نعلین لیکر پڑے
احترام و عقیدت کیساتھ چوما، آنکھوں سے لگایا، سر سے دستار کھول کر نعلین
شریف کو اس میں لپیٹ کر سر سے باندھ لیا۔

جذبہ شوق کا اضطراب لئے کارواں کیساتھ منزل بہ منزل دلی کی
طرف بڑھنے لگے۔ راستہ ہے کہ کٹنا ہی نہیں۔ زمین کی طنائیں جیسے سمٹنے
کے بجائے پھیلتی جا رہی ہیں۔ کبھی خوشی کے لہت ابھی جا نگسل ہوتے
ہیں۔ بالآخر جذبہ شوق کی گھاگھی میں دلی پہنچ گئے۔ سب سے پہلے پیرومرشد
تظاہرِ الحق و الشریعہ والدین کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے۔ قدمبوسی کی اور
دست بستہ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ارد گرد عاجتندوں، مرادیوں
اپنی بیجاؤں سب کا جمع لگا ہوا تھا۔ سلطان المشائخ کی آواز ابھری،
”خسرو! اقبال مند، عالی حوصلہ شہزادے کے ساتھ گئے تھے، فتح
کی جلو میں واپس آتے تو میرے لئے بھی کچھ لئے کہ بس خالی ہاتھ ملے
آتے؟“

اگرچہ صورت واقعہ پورے طور پر آپ پر روشن تھی۔ لوگوں کے دلوں
کے خطرات سے آگاہ رہنے والے سلطان المشائخ نے تجاہل عارفانہ سے
پوچھا کہ خسرو کی بے پناہ محبت کا تماشہ لوگ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں
اور لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ اس ترک سے میری شدید وابستگی یوں ہی

نہیں ہے سے

میں اس فارغانہ تجناہٹل کے عدتے

ہر اک دل کو چھیدا مراد دل سنجھ کے

نم آلود پیکوں سے عرض کرنے لگے۔ ایک غلام کی حقیقت ہی کیا جو سلطان فیض
و عطا کو کچھ پیش کر سکے۔ ہاں حضور والا کے قدموں کی ایک نشانی اپنے
سر کا تاج زدیں بنا کر قدمت اقدس میں حاضر ہو گیا ہوں۔ یہ میری حیات
کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر اسے شرف قبولیت عطا ہو جائے تو میرے لئے
سب سے بڑی سعادت ہوگی۔ یہ کہہ کر دستار سہ سے کھولی اور اس میں سے وہی
ہوتی نکال کر قدمت اقدس میں پیش کر دی۔

اے! یہ تو میں نے ایک مفلوک الحال مسافر کو دیدی تھی۔ تمہیں کیسے ملی،

جی ہاں قبلہ عالم! یہ وہی مقدس نعلین ہے جسے ہم نے اس سفر سے قیمتاً خرید لیا

» خسرو! تم نے اس غریب آدمی سے کتنے میں خریدی؟ میں بھی تو

کچھ سنوں۔ دستار سہ ریز لب چل رہا تھا،

» حضور والا! پانچ لاکھ تھکے میں!

» ہفت پانچ لاکھ؟

» جی سرکار والا تبار!

» خسرو! بسیار از ان خریدہ (خسرو! تم نے بڑے سستے داموں خرید لیا)

» سرکار عالی! خسرو غریب بھی اس غریب کی طرح غریب الوطن تھا۔

مسافرت میں میرے پاس یہی سب کچھ تھا۔ اگر میں دلی میں ہوتا تو اس کی بڑی

سے بڑی قیمت دے سکتا تھا، ایسے خسرو کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پیر و مرشد

کے قدموں سے لگ کر عزت پانچانے والی جوتی کو اتنے کم داموں پر خرید کر

شرمندہ تھے سے

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیران طریق
خانقاہ میں سنا طاطاری تھا۔ لوگ دم خود تھے۔ یہ محبت کیسی تھی؟ یہ
کیسا عشق تھا؟ تڑپ کی یہ کون سی منزل تھی؟ چاہت کا یہ کیسا انداز تھا؟
جذبِ دروں کی یہ کون سی کیفیت تھی؟ سے

یہ راز و نیاز محبت ہیں تاح

نہ وہ بے خبر ہیں نہ ہم بے خبر ہیں

یہی جذبہ سوزِ دروں تھا کہ سلطان المشائخ فرماتے تھے ”میں سب سے
تنگ آجاتا ہوں یہاں تک کہ اپنے سے بھی۔ مگر اس ترک (یعنی خسرو)
سے نہیں۔ اگر شرع اجازت دیتی تو ہم اور خسرو ایک ہی قبر میں آرام
کرتے۔“

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

خسرو سے حضرت محبوب الہی کی محبت کا اندازہ اس سے لگائے۔ فرماتے
ہیں ”کل میدان قیامت خدائے ذوالجلال نے مجھ سے پوچھا کہ نظام الدین
دنیا سے سیر لیے کیا لائے؟“ تو میں عرض کر دوں گا ”موتی! میں سیر لینے
اس ترک کے سینے کا سوز لایا ہوں۔“

فرماتے ہیں ”میں جنت میں اس ترک کے بغیر قدم نہیں رکھوں گا۔“

بلبل شیراز حضرت شیخ سعدی آپسٹے ہندوستان آئے۔ حضرت

خسرو سے امیر خسرو کی ملاقات ہوئی۔ کلام میں شیرینی الطافت، مقبولیتِ علم

کے لیے لعابِ دہن کی درخواست کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا۔
 ”یہ سعادت حضرت سعدیٰ حاصل کر چکے جو ان کا مقدر تھا۔ اب دوسرے
 کے لئے نہیں! — یہ سن کر آپ کو بڑا تکدر ہوا۔ چہرے پر تکدر کی کیفیت
 لئے قبیلہ عالم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی۔
 ”ترک کیا بات ہے؟ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟“
 ”پیر و مرشد روشن ضمیر ہیں۔“

”تم بھی تو کچھ کہو۔“

”آج حضرت خضر سے ملاقات ہوئی تھی۔ کلام میں شیرینی کے لئے
 لعابِ دہن کی درخواست کی تو یہ کہہ کر مسترد فرمادی گئی کہ یہ شیخ سعدی کا نصیب
 تھا جو وہ حاصل کر چکے۔ اب دوسرے کے لئے ممکن نہیں۔
 ”بس اتنی سی بات پر مٹا کر گیا اچھا پتا سامنے کھولا۔“

خسرو نے اپنا منہ کھولا۔ آپ نے ان کے منہ میں اپنا لعابِ دہن ڈال دیا۔
 اس کی بدولت کلام میں وہی ملاوت، وہی لطافت، اور آپ کے کلام
 بلاغتِ نظام کو جو قبولیتِ عام کی سند ملی وہ صبحِ قیامت تک کے لیے ایک
 ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

بیعت میں انفرادیت | والدِ محترم ابجدانی عمری ہیں
 لے کر سلطان الاولیاء، سرکار

محبوبِ الہی کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تاکہ دامنِ کرم سے وابستگی کا اعزاز
 مل جائے۔ جب خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو والدِ گرامی سے کہنے
 لگے، آپ اندر جائیے۔ میں یہیں باہر بیٹھتا ہوں بغیر بلائے نہیں جاؤں گا۔
 ذرا مسلسل بچپن ہی میں بیعت میں انفرادیت چاہتے تھے۔

والد ماجد اندر جا کر خاموشی کیساتھ بیٹھ گئے۔ امیر خسرو نے باہر بیٹھے بیٹھے ایک
رباعی نظم کی جسے زیر لب آہستگی سے گنگنانے لگے۔

تو آں شاہی کہ بر ایوانِ قصر ت

کیوتر گنشید باز گرد

غریب مستندے بر در آمد

بیاید اندروں یا باز گرد

تو ایسا بادشاہ ہے کہ تیرے قصر کے کنگورے پر اگر کیوتر بیٹھ جائے تو وہ بھی
باز بن جائے۔ ایک غریب جا جتند تیری چوکھٹ پہ حاضر ہو اوہ اندر آئے یا
یاہری سے واپس چلا جائے۔ یہ سوچ کر کہ اگر شیخ کامل ہیں تو ان کی نگاہ
دلوں کے خطرات پر بھی ہوگی۔ پھر اگر انھوں نے مجھے اپنی غلامی میں لینے کے
قابل سمجھا تو ضرور اندر بلائیں گے اور اگر انھوں نے نہیں بلایا تو ایسے ہی بغیر
ٹے واپس چلا جاؤں گا کہ وہ مرشد کامل ہی کیا جو دلوں کی دھڑکنوں سے
باخبر نہ ہو سکے۔ ابھی اس غور و فکر میں تھے کہ سلطان الاولیاء نے اپنے خادم
خاص سے سکر اتے ہوئے فرمایا: دروازے کے باہر ایک لڑکا بیٹھا ہوگا
اس کے سامنے یہ رباعی پڑھ کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے آؤ۔

بیاید اندروں مردِ حقیقت

کہ با نایک نفس ہمراز گرد

اگر ابلہ بود آں مردِ نادان

ازاں را ہے کہ آمد باز گرد

چاہئے کہ اندر آئے وہ مردِ نادان کہ میرے ہمراہ بیٹھ کر میرا ہمراز ہو جائے اور

اگر وہ مردِ احمق و نادان ہے تو اسے چاہئے کہ جس راستے سے آیا ہے اسی
راستے سے واپس چلا جائے۔

اتنا سننا تھا کہ انتہائی بیباکی کیساتھ اندر داخل ہونے پر دم شد
کے قدموں پر سر رکھا اور جان بے تاب کو ہمیشہ کے لیے ان کے حوالے کر دیا
تقریبِ محبت کی کیا خوب وہ ساعت تھی
جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہِ جمیں واقف

یوں تو سلطان الاولیاء خیر الاذکیا، امام الاصفیاء حضرت سیدنا و مولانا محمد
نظام الحق و الشریح والدین کے دامنِ کرم سے وابستہ ہو کر آفتاب و ماہتاب
بن کر چمکنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ حضرت بڑھان الدین غریب،
حضرت قطب الدین منور، علامہ فخر الدین زہادی، مولانا علاء الدین سیلی،
مولانا شمس الدین یحییٰ، سید نصیر الدین چراغ دہلوی، اخی سراج بنگالی،
مولانا حسام الدین ملتانی وغیر ہم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو علم و فضل، زہد و ورع
تقویٰ و طہارت، جذب و سلوک، اعتماد و یقین، توکل و استغناء میں ہمیش
و بے مثال تھے۔ ان نفوسِ قدسیہ کو بارگاہِ سلطان الاولیاء میں بڑا
قرب حاصل تھا۔ وہ خلافت و اجازت کی دولت سے مالا مال تھے۔ انھیں
میں "حضرت خسرو" بھی تھے۔ مگر ایک انفرادی شان لئے ہوئے۔ مزاج
اقہس میں بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ سلطان الاولیاء کی بارگاہ
میں اہم ترین معاملات میں خسرو سفارشی ہوتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ
سلطان الاولیاء، سرکار نظام الحق و الشریح والدین نے ان کی عرضداشت
کو رد فرمایا ہو۔ وہ اپنے ترکِ خسرو، کانا زانگھاتے تھے۔ ہر نازک و پر
آپ نے خسرو کے بجا اعتماد کی راج رکھی۔

سلطان علاء الدین خلجی کے دو خاص درباروں، ملک نصرت، اور محمد علی زنبیلی جو سلطان الاولیاء کے مرید بھی تھے۔ انہوں نے پیر و مرشد سے حضرت برہان الدین غریب کی شکایت کر دی۔

” حضور اب آپ کی بارگاہ کے تربیت یافتہ، آپ کی صحبت یافتہ مخصوص خلفاء میں بھی تن آسانی اور عیش پسندی آتی جا رہی ہے۔ ابھی سے شیوخ کے طریقے پر سجادگی پر بیٹھنے کی مشق شروع ہو گئی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم لوگ! وہ کون لوگ ہیں؟“

”حضور والا! ہم بالکل درست کہہ رہے ہیں اب یہی برہان الدین غریب کو لے لیجئے۔ دیکھنے میں بالکل مسکین صورت، نیک نفس، شریف النفس عبادت گزار، صاحب تقویٰ اور آپ کے خاص غلاموں میں سے ہیں۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ وہ ایک کیل کو تہ در تہ کر کے اسے ادنجا کرتے ہیں۔ پھر شاخ کے طرز پر اس پر تشریف رکھتے ہیں۔ بھلا ان کو ابھی سے ایسا کرنے کی ضرورت تھی؟ وہ پیر و مرشد تو نہیں ہو گئے کہ انداز نشست کو اس طرح سے اپنائیں اور سجادہ شہنی پر بیٹھیں۔“

یہ سن کر سلطان الاولیاء کے مقدس چہرے پر رنج و ملال ظاہر ہوا فوراً خادم خاص کو بلایا۔ ”اقبال!“

جی حضور!

”دیکھو خانقاہ میں برہان الدین غریب بیٹھے ہوں گے ان سے کہو کہ وہ یہاں سے فوراً اپنے گھر چلے جائیں اور اب ان کو یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہاں میرا خلافت نامہ بھی واپس لے لینا سخت وحشت کے عالم میں خادم خاص، اقبال غریب کے پاس

گیا۔ اس غریب کو اس غریب پر ترس آ رہا تھا۔ بچاڑے سیدھے سادھے نیک
 خدائیں سوکھی بڈیوں کا مجموعہ غریب! واقعی غریب ہو چکے تھے۔
 جھکتے اٹکتے خادم کہنے لگا۔ جناب عالی! سرکار کا حکم نامہ لے کر
 حاضر ہوا ہوں۔

سراپا اشتیاق بن کر: کیا حکم ہے آقا کا؟

آپ اپنا خلافت نامہ واپس کر کے ابھی خانقاہ سے چلے جائیں اور پھر
 اب یہاں مت آئیں۔ یہ حکم سناتے ہوئے حقیقتاً بہت افسوس ہو رہا ہے۔
 ملک نصرت اور علی زنبیلی حضرت کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ معلوم
 ہوتا ہے کہ انھوں نے ہی کچھ لگائی بھائی ہے۔

اتنا سنتے ہی غریب بدحواس ہو گئے۔ زمین آرزو پر بجلیاں گر پڑیں
 گریہ بے اختیار نے آنکھوں کو سادون بھادوں بنا دیا۔ آہ! میں تباہ و برباد
 ہو گیا۔ مرکز حیات ہی جب روٹ گیا تو اب زندگی کس کام کی؟
 برستی آنکھوں سے خلافت نامہ واپس کیا، کھیل کا بندھن پر دکھا اور
 لرزیدہ قدموں سے اپنے حجرے کی طرف چل دیئے۔ اب صرف وہ تھے اور
 ان کی گریہ تہنسانی! سے

سوکھی ہیں بہت دیر سے پکوں کی زبانیں
 بس آج تو دل بھر کے رُلانے کوئی آکر

دربار سرکار سے فرصت پا کر گئی دن کے بعد خسرو سلطان الاولیاء کی بارگاہ
 میں پہنچے۔ سب نظر آئے مگر غریب نہیں۔ موقع پاتے ہی خادم خاص
 سے پوچھا۔

اقبال! غریب کہاں ہیں؟

» اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ابھی کچھ نہیں معلوم !!!»

» ارے بھائی پہلیاں مت بھاؤ ! کیا کوئی حادثہ پیش آگیا اس کو؟

» حادثہ سے بڑھ کر ! پیر و مرشد نے انھیں خانقاہ سے نکال دیا۔ اپنا

خلافت نامہ بھی واپس لے لیا اور خانقاہ میں آنے پر پابندی لگا دی۔

» آخر کیوں؟

» یہ ملک نصرت اور علی زنبیلی کی شرارت ہے۔ وہ کبلہ کے

خانقاہ میں بیٹھے تھے۔ اس کے متعلق کچھ لگائی بھائی کر کے پیر و مرشد کو ناراض

کیا ہے۔ اب وہ کہیں نکلتے بھی نہیں۔ بس اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئے

ہیں۔ گھر کے اندر اکثر دوتے رہتے ہیں۔ سب لوگوں کو اس حادثہ کا بڑا

قلق ہے لیکن حضور کی بارگاہ میں کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ آپ ہی پر سب

کی نگاہیں ہیں سے

خدا گواہ بھری انجن میں میرے سوا

نہیں ہے کوئی جو ان کی نظر کو پہچانے

امیر خسرو » غریب « کے گھر تشریف لے گئے۔ دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھلا۔ جیسے ہی خسرو پر نظر پڑی، دودھ کر پٹ گئے۔ کہاں سے میرے

بھائی ! میرے دوست ! یہاں مجھ پر کئی قیامتیں گزر گئیں اور تم اب آئے ہو۔

» غریب ! میرے بھائی، تم گھبراؤ نہیں اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مجھے ملک نصرت اور زنبیلی کی شرارتوں کا علم ہو چکا ہے۔ تم ابھی میرے ساتھ

چلو، میں معافی دلوادیتا ہوں «

» نہیں خسرو ! نہیں ! میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ ناراضگی کے عالم

میں قبضہ عالم کا سامنا کروں «

» اُسے بھائی تم چلو تو سہی، تمہیں کون کہتا ہے کہ تم میرے حضرت کے
روبرو کھڑے ہو جاؤ۔ تمہیں حضرت کے سامنے اس وقت پیش کروں گا جب
وہ تم سے راضی ہو چکے ہوں گے۔

دونوں ساتھ ساتھ حضرت سلطان الاولیاء کی خانقاہ میں آئے۔
غریب کو خسرو نے ایک گوشے میں بٹھا دیا اور خود منگے سر، ننگے پاؤں، دستار
گلے میں لپٹی ہوئی عنقود تقصیر کے لئے بحرمانہ انداز لئے حاضر ہوئے۔ خسرو کو
اس انداز میں دیکھ کر آپ تبسم ریز ہوئے سے

یوں سکر لئے جان سی کیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہونے کے گلستاں بنا دیا

» ترک کیا بات سے ہے»

» بندہ پرور! غریب کی خطا معاف کر دی جائے!»

» غریب کا تصور تمہیں معلوم ہوا ہے»

» جی میرے آقا! وہ گناہ ہے گناہی کا مرتکب ہوا۔

» یعنی وہ تمہاری نگاہوں میں ہے تصور ہے، اسے ناکردہ گناہوں

کی سزا دی گئی ہے»

» وہ صفائی کی جہات نہ کر سکا۔ ورنہ حضور کی نگاہوں میں مجھ

بے تصور ہوتا»

» تو اس کی طرف سے تم صفائی پیش کرنے آئے ہو»

» نہیں اس کی طرف سے خطا کی معافی چاہنے آیا ہوں»

» جب خطا ہی نہیں تو معافی کا کیا سوال ہے»

» اس کے گناہ بے گناہی کی یہی تفصیل تو حضور والا کی بارگاہِ کرام

تک پہنچی ہے کہ بڑا الدین کبل تک کے مشائخ کے طریقے پر ابھی سے بیٹھا ہے۔ بے شک وہ برہان الدین کبل تک کے اس پر بیٹھتا ہے مگر مجبور ہو کر! آپ کی نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خانقاہ عالیہ میں سوکھی ہڈی کے بجر کا نام ”برہان الدین غریب“ ہے۔ خصوصاً اس کے پاؤں کی ہڈیاں کس قدر سوکھی ہیں! اپنے پاؤں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کی وجہ سے وہ تنگے فرش پر نہیں بیٹھ پاتا! بس اتنی سی بات کو ہمارے پیر بھائیوں نے افسانہ بنا دیا۔“

”اچھا! لیکن وہ دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔ آخر کہاں رہتا ہے؟“

”ابھی حاضر کئے دیتا ہوں۔“

غریب قدموں پر آگر گر پڑے۔ سرکار عالی نے سینے سے لگا لیا سینے سے لگاتے وقت ایک غریب کو سلطان فیض و عطا نے جو کچھ عطا فرمایا اسے فوراً دینے دیکھ لیا اور آج سات سو سال سے زیادہ ہوا۔ دنیا دیکھ رہی ہے۔ سینے سے لگانے کے بعد نئے سرے سے اجازت و عنایت عطا فرمائی۔ کچھ دنوں کے بعد دولت آباد دکن کی طرف مخلوق خدا کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر سلسلہ عالیہ چشتیہ کو وہ نقطہ عروج عطا فرمایا کہ

ثبت است بر جریۃ غنالم دوام ما

خلقت اس قدر رجوع ہوئی اور ولایت کا آوازہ اس قدر بلند ہوا کہ آپ کے نام پر بڑا پور، شہر آباد ہوا۔ وہی برہان پور جو دو سال تک عناد و شای حکومت کا پایہ تخت رہا۔ جسے مدینۃ الاولیاء، دارالسرور و برہان پور شریف بھی کہا جاتا ہے جو مدھیہ پردیس کا ایک عظیم تاریخی شہر ہے۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی داستانیں اس سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے اس شہر کی تعمیر و ترقی، تنگ نظری و عنصیت کا شکار ہے۔ ورنہ اس کے مقابلے میں

کھڑوہ جو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، اسے تعمیر و ترقی کے آسمان پر پہنچایا جا رہا ہے۔ لیکن بیچارہ برہان پور جو ایک عظیم قوم کی داستان عظمت و جلال سے منسوب ہے۔ اس کے ساتھ سوتیلا سلوک برتا جا رہا ہے سے
 پڑی ہے لاش تعصب کی دورا ہے یہ مگر
 اک جنازہ ہے جو قوموں سے اٹھائے نہ بنے

امیر خسرو کون تھے؟ وسط ایشیائی ترکوں کا ایک قبیلہ لاجپن

سمرقند کے قریب شہر کیش "جو بہت بعد
 میں شہر "سنز" کہلایا۔ جسے امیر تیمور کے شہر سنز سے زیادہ شہرت ملی۔ وہ
 چنگیزی حملوں کے درمیان وطن سے بے وطن ہو کر بلخ میں آسا۔ ۱۲۲۲ء
 میں تاتاریوں کا ایک زبردست لشکر خود چنگیز خاں کی قیادت میں سمرقند و
 بخارا کو تباہ و برباد کرتا ہوا بلخ کی طرف بڑھا دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سو مسودوں
 والے اس عظیم اسلامی شہر میں ایک سال بعد کوئی دیا جلانے والا نہیں رہ
 گیا۔ امیر سیف الدین محمود اپنے قبیلے کی ایک شاخ "ہزارہ" کے سردار تھے
 حملے کے وقت بلخ چھوڑ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ عالم اسلام پر چنگیزی
 عتاب کے بڑے ہندوستان کو پناہ گزینوں کا مسکن بنا دیا تھا۔ ادھر کے اجرے
 ہوئے بہترین شہسواروں، مدبروں، دانشوروں اور اصحاب علم و فضل
 کے لئے بالغ نظر درویش صفت بادشاہ شمس الدین التمش کے فداوارے
 کھلے ہوئے تھے۔ انھیں پناہ گزینوں میں سیف الدین محمود بھی تھے۔ ابتدا
 چند سال معمولی خدمتوں میں گزرے۔ بعد میں انھیں مہرا سے ایٹھ جانے والی
 شاہراہ پر گنگا کے کنارے پٹیالی عرف مومن آباد قصبے میں ایک چھوٹی سی جاگیر
 عطا ہوئی۔ سیف الدین محمود کی شادی ایک ہندوستانی امیر عادل الملک کی بیٹی دو ناز ہوئی

چار بچے یعنی ایک بیٹی تین بیٹے تولد ہوئے۔ یحییٰ الدین محمود ان میں سے تھے۔
 جو ۱۲۵۲ھ سے ۱۲۵۱ھ میں پیدا ہوئے جو اپنے تخلص اور موروثی خطاب "امیر"
 کی بدولت "امیر خسرو" کہلائے۔ امیر خسرو کی شہرت اتنی ہوئی کہ اصل نام
 دب گیا۔

اس مختصر توضیح سے معلوم ہوا کہ آپ ہندی الاصل تھے۔ جیسا کہ آپ
 کا یہ شعر بھی دلالت کرتا ہے۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جو اب
 شکر مصری ندادم کز عرب گویم سخن

آٹھ سال کی عمر میں پدر بزرگوار کی شفقوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نانا
 امیر عماد الملک نے آپ کی خصوصی تربیت و پرورش کی۔ عماد الملک حکمت
 وقت کے چار بڑے ستونوں میں سے ایک تھے۔ ۷۰ سال غرض ممالک
 (سکرٹری محکمہ بخشی گری) رہے۔ دو سو ترک غلام، دو دو ہزار سپاہ
 غلام، ہزار سواران کے جھنڈے تلے رہتے تھے۔ پچاس آدمی تو صرف
 ان کے پانڈان، خاقدان پر ملازم تھے۔ بڑے مخیر، سخی حاتم تھے۔ ایسے
 صاحب حسمت و منصب و جاہ کے نواسے..... یحییٰ الدین خسرو
 محمود تھے۔

بیس سال سے کم عمر میں انھوں نے ایک دیوان "تحفہ القاری"
 لکھا، اور عمر کی بیسوس بہار پر پہنچ کر جب وہ کسب معاش اور فکری روزی
 میں نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک بہترین دیوان ان کے ساتھ تھا۔ عملی
 زندگی میں سب سے پہلے سلطان بلبن کے شاہ خرچ بھتیجے علاء الدین کشلو
 عرف ملک بھجو کی ملازمت اختیار کی۔ دو برس وہاں رہ کر سلطان بلبن

بیٹے بفرخاں سے شناسائی حاصل کی۔ بفرخاں سامانہ کا حاکم تھا جسے بعد میں ریاست پٹیالہ کہا گیا، امیر خسرو علاء الدین کشلو کی ملازمت چھوڑ کر بفرخاں کے پاس سامانہ آگئے۔ ناصر الدین بفرخاں نے خسرو کو اپنا ندیم بنایا یہیں انھوں نے پنجابی زبان سیکھی اور اس کے لوگ گیتوں کی لئے۔ ۱۲۷۹ء میں حالات نے انھیں بنگال کے صدر مقام لکھنوتی پہنچا دیا۔ مگر وہاں آپ زیادہ دن نہ رہ سکے، واپس دہلی آگئے۔ سلطان بلبن کے سپہ سالار ولی محمدیٹے سلطان محمد قان سے رابطہ قائم کیا۔ ۱۲۷۹ء میں شہ زادے کی خدمت میں سلطان ہمایون کو کلام سنایا۔ اس وقت درپند کے گئے اور اس احمد از میں پذیرائی ہوئی جو خسرو کے وہم و گمان میں نہ تھی۔

پنجاب سے دو دووں کے لیے سلطان فوجی جھاوٹی تھا۔ ملاز شہزاد بادشاہ، اولیاء، اصغیاء، اتقیاء، کاکدش۔ اس کے علاوہ عراق ہجر کے بوسیدوں کا جنگل تھا۔ شہزاد سلطان محمد قان ذی علم و صاحب فکر و نظر، پادشہ، فیاض، شاعری و کسبستی کا علاوہ، شمشیر و سنان کا درجہ و درجہ دووں میں بے مشابہ تھا اس کا دربار خسرو کیلئے بہترین تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر خسرو نے اپنا دروس سزا دیوان و وسطا ایقوہ ترتیب دیا۔ یہیں قول (حدیث) کے عربی لہجہ کو بوسیدتی سے جوڑا جسے بعد میں قول قلینانہ سے شہرت ملی۔ یہیں عربی اور ترکی ہازوں کو پنجاب کے لوگ گیتوں کے لئے استعمال کیا۔ یہیں انھوں نے عربی و فقہ کی تحصیل و تحصیل کی اور ستیس قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے جو اب تک کسی کے لئے نہیں لکھے تھے۔ پہلی بار انھیں ایک لائق بہت اور فیاض، سیر چشم، جوہر شناس، قدرواں مدوح ملا تھا۔ منگولوں

کے ساتھ ایک زبردست معرکے میں سلطان محمد شہید ہو گیا۔ خسرو بھی گرفتار ہوئے مگر ہزار خزانہ ہتھیاروں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔
 واپس دہلی آگئے۔ کچھ دن وہاں رہ کر ماں اور عزیزوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن پٹیالی آگئے۔ اور وہیں رہنے لگے۔ مگر دلی کے دریا کی حالت پر برابر نظر رہی، امراء کی سازش، سیاسی داؤوں و پیچ، حالات کے اتار چڑھاؤ سے برداشتہ خاطر ہو کر امیر علی مرجا نبار خاتم خاں سے وابستہ ہو گئے۔
 دو سال اودھ میں رہے۔ برج بھاشا، اودھی بول چال، وہاں کی اپنی لوح وارتہذیب، مخصوص انفرادیت، نفاست، نزاکت تو بہت پسند آئی مگر زیادہ دن دلی سے دور نہ رہ سکے۔

جیسے ہی دلی پہنچے، سلطان معز الدین کی قیادت نے بلا بھیجا۔ خاطر خواہ قدر افزائی کی۔ تین ہزار نو سو چالیس اشعار پر مشتمل مثنوی «قوان السعدان» چھ ماہ کے بعد مکمل کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ مثنوی کئی حیثیوں سے نہایت ہی اہم ہے۔ باپ بیٹے کی تاریخی ملاقات جو قتل و غارتگری کے بجائے شفقت و محبت میں بدل گئی۔ خسرو اس کے چشم دید گواہ تھے۔ سلطان نے جی کھول کر داد دی۔ خوب انعام و اکرام سے نوازا اور ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا۔

معز الدین کی قیادت کے بعد جوڑ توڑ کی سیاست نے عنان حکومت جلال الدین خلجی کو دی۔ اس کے مختصر دور حکومت میں خسرو مقرب بارگاہ سلطانی تھے۔ یہاں تک کہ فوجی مہمات میں بھی ساتھ ساتھ رہتے۔ اس کی جنگی مہموں کی یادگار میں ایک مثنوی «مفتاح الفتح» لکھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کا عہد اس حیثیت سے خسرو کے لیے بڑا مبارک و باک

اس کے مختصر عہد حکومت میں خسرو کو سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں زیادہ سے زیادہ موقع حاصل ہوا۔ اگرچہ حضور محبوب الہی کی غلامی میں عہد طفلی ہی سے آگے تھے مگر کسب معاش اور روزگار سے انھیں ایسے مواقع کم میسر ہوئے۔ اسی بادشاہ کے عہد میں آپ نے اپنا سب سے اہم دیوان "عزۃ الجمال" اپنے صاحب نضر اور بزرگ دوستوں کے مشورے پر ترتیب دیا۔ یہ پہلا دیوان تھا جس میں حمد الہی و نعت مصطفائی کے بعد بادشاہ کی تعریف سے پہلے اپنے نبیر و مرشد سلطان الاولیاء حضرت سید نظام الدین محبوب الہی کی مدح فرمائی۔

۱۶ رمضان المبارک ۹۹۵ھ بروز بدھ ۱۵ نومبر ۱۵۸۷ء، نزم نو، کرم کشا، رحمدل، چشم پوش، کشادہ دل، کشادہ دل، کشادہ مزاج، کشادہ ظرف، خوش مزاج، خوش خصال، خوش اطوار بادشاہ سلطان جلال الدین خلی کو اس کے سگے داماد، سگے بھتیجے، اور پروردگار نے دھوکے سے قتل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اس نے اپنے پیشوا و مرشد سید جلال الدین خلی کے برعکس بلبن کی سخت گیر مہلے اور غیرت اعراد پالیسیوں کو اپنا پالیسی بنایا۔ بیس سال تک بڑی شان و شوکت، بڑے بڑے جہاز و جہاز اور شاہانہ طہرات سے حکومت کی اور اپنے عزم و یقین، فاتحانہ حوصلے اور زبردست تسخیری قوت کی بدولت وہ ایک نئے نئے و انانقش چھوڑ گیا۔ ایسے سخت گیر، کھردرے اور غیر شاعرانہ مزاج رکھنے والے بادشاہ کے یہاں بھی خسرو کا منصب و وظیفہ برقرار رہا۔ اس نے خسرو کو اپنی درباری زینت بنائے رکھا۔ سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا۔

اپنے اور سلطان المشائخ کے درمیان انھیں رابطے کی ایک کڑی سمجھتا۔ سلطان الاولیاء کی بارگاہ سے خسروہی کے ذریعے رابطہ قائم رکھتا اور ہر کڑے وقت اور کڑی آزمائش میں آپ کی دعاؤں کا طالب رہتا۔

دورِ علانی آپ کی شاعری کا نقطہ عروج ہے۔ اس کے عہد میں کئی مثنویاں اور نغمے لکھے۔ مثنوی سیلی مجنوں اسی عہد یعنی ۱۲۹۹ھ کی یادگار ہے۔ عہدِ علانی کو بارہ برس تک پرکھنے کے بعد اپنے قلم کا پہلا نثری سرمایہ "خزائن الفتح" لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ علاء الدین غلی کے دور کی شمالی و جنوبی فتوحات کی ایسی منہ بولتی تصویر ہے کہ اس کا نام ہی "تاریخِ علائی" پڑ گیا۔

عہدِ علانی ہی میں آپ نے سلطان المشائخ کے اقوال کو "فضل الغواہ" کے نام سے قلمبند فرمایا۔ جو آج تصوف کی راہ کا سنگ میل ہے اور نفحات الانس، فواید الغواہ، سیر الاولیاء، تذکرۃ الاولیاء، طبقات الاولیاء، اخبار الاخیازاؤ تاریخ فرشتہ وغیرہم ہی کی طرح ایک ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضخیم نثری تصنیف "رسائل الاعجاز" بھی دورِ علانی ہی کی دین ہے۔

پھر ہندوستان کی بساط سیاست پر نئی چالیں چلی گئیں۔ ادھر قصر ہزارستون میں علاء الدین نے جان جان آفریں کے سپرد کی ادھر سازشیوں کی چال نے اس کی مضبوط ترین حکومت کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیئے۔

علاء الدین غلی کے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے عمان حکومت ہاتھ میں لی۔ مگر نوجوان بادشاہ نے عیش و طرب، ظلم و بربریت، سفت کی و خوزیری، اپنوں کو دشمن بنانے کے علاوہ ایک بے حد طردار حسین، رعنا اور خوبصورت، یادو قبیلے کے حسن نامی نوجوان کے ساتھ عشق نہیں ہو سکا۔

رانی اور اس کے ساتھ عیش و طرب میں بڑا بدنام ہوا۔ بالآخر ۱۳۳۲ء مطابق ۱۲۷۱ھ جمادی الثانی کی چاند رات کو اپنے اسی شریک بزم عیش و نشاۃ کے ہاتھ بیدردی سے قتل ہوا۔ خاندان نلانی کے کسب بچوں تک کو چن چن کر قتل کر دینے کے بعد خسرو خاں کے لقب سے تخت نشین ہوا پھر تو اضطراب و بے چینی کا ایک نیا دور شروع ہوا بالآخر تاریخ نے ایک اور کروٹ لی۔ غازی ملک تعلق نے سخت خونریزی کے بعد اسے شکست دے کر قتل کیا اور حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

خسرو اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ دربار تعلق کی زینت بن گئے اور وہ بیل ہزار داستان، وہاں بھی نقشہ سنج ہوا۔

تاریخ کا یہ اجمالی پس منظر بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ خسرو کی عظمتوں کے نقطہ عروج کا پس منظر بھریں آج کے شاہد شاہزادوں کے درباری شاعران کے مزاج میں اثر و رسوخ رکھنے والے اتنی عظمتوں، رفعتوں اور آفاقی شہرتوں کے خاں خسرو سلطان الاولیاء سرکار محبوب الہی کے بند بے دام تھے۔

سلطان الاولیاء ہر ایک کو بے حیل و حجت شرف بیعت سے نوازتے، امن و محبوبیت ہر ایک کے لئے کشادہ تھا۔ سید کا، گدگد، نیکو کار، امیر، غریب، فقیر، رئیس، درویش سب ان کے دامنِ کرم سے وابستہ ہوتے خسرو عشاء کی نماز کے بعد حاضر بارگاہ ہوتے۔ شہر بھر کی خبریں اور درباری حالات سناتے۔ اس کے بعد مجلس سماع منعقد ہوتی سلطان المشائخ کی طرف مخلوق کا بے پناہ رجوع اور ہر دل عزیز، حکومت اور بادشاہ سے بے تعلقی سے نیازی اور حامدین کی لگائی بھائی سے غیاث الدین آپسے بدگمان

ہوا۔ ایک بار حکم دیا کہ آپ دربار میں آکر سماع کے متعلق وضاحت کریں۔ علمائے دین کی طرف سے اعتراض ہو رہا ہے۔ آپ اپنے خدام اور رفقاء کے ہمراہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے۔ کتابی علماء اور بادشاہ کو بدلائل احسن مطہین کیا۔ بادشاہ نے واپسی کی اجازت میں نہ تو سماع کے متعلق کچھ منع کیا اور نہ ہی کھلی چھوٹ دی مگر اس قدر باوقار رہے نیازانہ انداز میں آپ کا بادشاہ کے دربار سے واپس آنا اسے بہت کھل گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ناگواری سوئے ظن و حسد کے سرحد میں داخل ہو گئی۔ بالآخر جلایا اتنا بڑھا کہ ۳۳۳ھ میں بنگال کی مہم پر جاتے وقت کہلو ابھیجا کہ میری واپسی تک دہلی چھوڑ دیں۔

اس مہم میں خستہ و بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔ بنگال سے واپسی میں پھر ایک بار قاصد بھیجا کہ میرے آئیے پہلے پہلے دہلی چھوڑ دیں آپ کے خدام و اہل ہجرت میں تشویش و اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر آپ بڑے پرسکون تھے بڑے اطمینان بھرے لہجے میں فرمایا «بنو زوی دور است» (ابھی دہلی دور ہے) یہ تاریخی جملہ بعد کو کہاوت بن کر آپ کی خدادیدہ زبان حق ترجمان سے نکلا تھا جو بے ادب، بدنصیب تغلق کی تقدیر بن گیا ہے

گفتہ اوگفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم جدا شد بود

غیاث الدین تغلق کو دہلی آنا ہی نصیب نہ ہوا۔ ۳۳۳ھ کی آخری تاریخوں میں دہلی شہر سے باہر بیٹے نے باپ کے استقبال و اعزاز کے لیے ایک لکڑی کا شاندار محل بنوایا۔ سعادت مند بیٹے نے فخر مند باپ کا اسی طرح استقبال کیا۔ باپ نے بیٹے کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اسی رات محل کی چھت زمیں بوس ہوئی۔ غازی ملک تغلق اپنے انجام کو پہنچا۔ اللہ کے ایک

برگزیدہ بندے کی دلازاری کی اسے بڑی قیمت دینی پڑی ہے

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو

ید بیعتا لے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

۱۶ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ کو سلطان المشائخ سیدنا میر کار محبوب الہی

نظام الدین اولیا نے اپنے سب سے زیادہ صاحب تقویٰ مرید و خلیفہ حضرت

سید نصیر الدین چراغ محمود کو خلافت و جانشینی عطا فرما کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت امیر خسرو اس وقت بادشاہ کے ہمراہ بنگال میں تھے۔ جوں ہی یہ خبر

وحشت اثر ان تک پہنچی، جو اس باختم ہو گئے۔ ملازمت سے استعفاء دیدیا۔

حاکم بھاگ دئی ہوئے، زار و قطار روئے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ یہ کیسی عجیب

بات ہے کہ آفتاب زیر فاک سو گیا اور خسرو ابھی زندہ ہے۔ سر کو پتھروں سے

نکراتے رہے۔

اب ہم ہیں اور ما تم ایک شہر آرزو!

ٹوٹا وہ آئینہ کہ جو تیس سال وار تھا

ہی کیفیت چھ ماہ تک رہی۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ تن کی خبر، نہ گون رات روتے

رہتے۔ اکثر رات کو اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روتے کہ دیکھنے والوں کو ترس لانے

لگا۔ ٹھیک چھ ماہ بعد ہی دن اسی تاریخ کو قبر انور پر سر رکھا، سر و آہ کھینی،

زور سے یہ دوبا کہا ہے

گوری سوئے سب پر منہ پر ڈالے کیس

چل خسرو گھر اپنے سنا، کچھ بھی ہو دیس

اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی ہے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پوری دنیا ایسی محبت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ محبت ہی کی جلو آرائی تھی کہ حضرت سلطان الاولیا، فرمایا کرتے تھے جسے میری قبر پر آنا ہو تو خسرو کی قبر پر حاضری دے۔ سات سو سال سے زائد ہو گئے، یہ رسم جاری ہے۔ عوام و خواہں سبھی پہلے خسرو کی بارگاہ عشق میں حاضری دیتے ہیں۔ اس کے بعد محبوب الہی کی چوکھٹ کو چومنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق: "خسرو جیسا انسان آج تک خاک ہند پیدا نہ کر سکی" ہے

لے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سنتے
جو آگ بھادے گی وہ آگ لگائی ہے

بِزبانِ حکایت شہزادی

جمالِ وزیرانی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ حیا آلود انداز لے جب دہلی کی
کے پیر میں ڈھلتی ہے تو ماحول کو سرگوشیوں کی زبان بل جاتی ہے۔ حمیدہ اوصاف
پاکیزہ صفات کی اصنافی خوبیاں اور معنوی تہذیب، تابانیِ حسن اور رعنائی،
شہاب کی سحر آفرینی اس کی تسخیری قوت کو دو چند کر دیتا ہے۔ کرمان شاہ
کا وہ گل رعنا، نسوانی وقار کی آبرو اور اس کے حسن کا نمائندہ و ترجمان
بن کر جب شہاب کی دبلیز پر پہنچا تو آبشاروں کا ترنم، نغمہ بارغیوں کا تبسم
شکبار پھولوں کی نزاکت شرمسار اور کمکشاں کا جمال ڈھنگ رنگ ہو گیا۔

رُخسے تاباں زلف مشکیں قامت رعنا تیسرا

سرو ہے، سنبل ہے اور غور شید عالم تاب ہے

ایران میں دشتِ لوط کے مشرقی جنوب میں کرمان شاہ ثانی جگہ آج بھی موجود ہے
دو صدی، بھری (سلسلہ) میں وہاں پر شاہ شجاع کی حکومت تھی جو
رعنا شہسوار، بہادر سیر و شکار کا رسیا، عیش و طرب کا دلدادہ، بکر اور
سے دور، اندیشہ ہائے فردا سے بے نیاز، گھوڑ سواری میں اس قدر ماہر کہ
لو الفوارس اس کا لقب۔

اس کے عیش و طرب کا سلسلہ دن رات یونہی جاری تھا۔ حیات

اپنی تھمتر رعنائیوں کے ساتھ اس کے گرد رقص کناں تھی۔ ایسے تنگ دامن میں
زندگی کی تمام سترتیں سمیٹے ہوئے تھا۔ سیر و شکاری اس کے حیات کا حاصل
تھا گویا وہ

باہر بہ عیش کوشش کہ عالم دو بارہ نیست

کی علی تفسیر تھا کہ اسی اثناء میں اس پر ابدی سعادتوں کا دروازہ کھلا، روح کی
بہاروں کا موسم آیا، گل قدس کی خوشبو اڑی، اس کے روح کی ارجندی کے
نقطہ خروج کا آغاز اس طرح ہوا کہ دوران شکار ایک مرد غیب کی ہلکی سی
تنبیہ نے اس کے کائناتِ دل کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اس کا دل دنیا کی رنگینوں
سے اس طرح اچاٹ ہو گیا کہ وہ فوری طور پر تخت و تاج سے دستبردار ہونے
کا اہم ترین فیصلہ کر ڈالا۔ گھر پہنچتے ہی اہل خاندان کو اکٹھا کیا اور ان پر
اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ "پورے خاندان اور محل میں اس فیصلے سے کھلبلی مچ
گئی۔ ہزار دباؤ، ہزار فہمائش، منت و سماجت، الحاح و زاری کے باوجود
وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔"

انھتی نہیں بگاہ کسی اور کی طرف
پابند کر گئی ہے کسی کی نظر سے مجھے

چھوٹے بھائی نے بڑے ادب سے عرض کیا "بھائی جان! عجلت
میں کوئی فیصلہ اور وہ بھی اتنا بڑا دیرپا نہیں ہوتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو
اپنے اس فیصلے پر افسوس کرنا پڑے۔ اس لئے جلدی نہ فرمائیں، کچھ دن رک کر
خوب غور و خوض کر لیں۔" جان برادر! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ افسوس تو
اس بات پر ہے کہ عمر کا اتنا قیمتی حصہ ضائع ہو گیا۔ حیاتِ مستعار کی چند
سامیں اور باقی رہ گئی ہیں کیا پتہ وہ کب ٹوٹ جائیں۔ اور ابھی تم نے

اپنی آخرت کے لیے کچھ کیا ہی نہیں۔ تم تخت و تاج سنبھالو، یہ تمہیں کو مبارک
اب میں ایک دن بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ پھولوں کا یہ سیج میرے لئے کانٹوں
کا بستر بن گیا ہے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دیکھی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم فصل بہاراں بھول گئے

شریک حیات نے ڈبڈبائی آنکھوں سے عرض کیا: "میرے سرتاج!
ایک دم سے فیصلہ کرتے وقت میرا اور اس نازک سی پتی کا تہنہ لگی شاہی
محل میں صرف آنکھیں کھولی ہیں، خیال کر لیا ہوتا۔ ہماری شہستانِ محبت
کا یہ مسکراتا ہوا پھول جسے پھولوں کا سیج اور لطیف آغوش ہی ملے ہیں اس
کا کیا ہو گا؟"

"ارے نیک بخت! چرتدوں، پرتدوں، درندوں کو اور کیتروں کو رو
تک رزق عطا فرمانے والا رب کیا ہمیں چھوڑے گا؟ دنیا میں پھیلے ہوئے
کر وڑوں مخلوق جس میں اس کے فرماں بردار، نافرمان اور باغی سب شامل
ہیں۔ حدیث ہے کہ وہ انہیں بھی اپنے فضل سے رزق عطا فرماتا ہے جو سرکے
ہی اس کے وجود کے منکر ہیں تو کیا ہمیں وہ اپنے فضل سے محروم رکھے گا۔ جبکہ
ہم صرف اسی کے لیے تخت و تاج چھوڑ رہے ہیں۔"

دوستاں را کجا کئی بھٹسروم
چونکہ با دشمنان نظر داری

دیے تمہیں اختیار ہے۔ اپنی اور پتی کے بہتر مستقبل کے لیے
شاہی محل میں رہ جاؤ یا آزمائش کی اس کڑی دھوپ میں میرا ساتھ دو۔
میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا کہ دنیا جہاں کی مشقتیں جھیلنے میں بھی تم میرا

ساتھ ضرور ضرور دو، نہیں نہیں میرے سرتاج! جب میں بزم عیش و طرب میں
 اور سرتیں سمیٹنے میں آپ کے ساتھ تھی تو دنیا کا دکھ پھیلنے کے لئے میں تنہا آپ
 کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ میں رفیقہ حیات ہوں، رفیقہ عیش و نشاط نہیں۔
 میرا ماجینا آپ کے ساتھ ہے جو آپ اپنے لیے پسند کریں وہی میرے لیے
 بھی پسند فرمائیں۔ میرے لیے وہ جو نیٹرا ہی شاہی محل ہو گا جہاں آپ
 ہوں گے سے

دیکھیں گی بھی اب کس کو تیرے بعد یہ آنکھیں

میں تجھ سے بچھڑ کر رہوں گی شہر میں تنہا

اطاعت شعار، فرماں بردار، پیکر وفا اور سعادت مند بیوی کے
 جواب نے موصولوں کو بڑی توانائی بخشی، بالآخر سارے محل کو روتا بلکتا
 چھوڑ کر حکومت اپنے چھوٹے بھائی کو سپرد کر کے اپنی بیوی اور بچی کو لے کر
 محل سے باہر نکل آئے اور اسی شہر کی مضافات کی بستی میں ایک معمولی سا مکان
 بنا کر رہنے لگے۔ ایک عام اور معمولی انسان کی طرح یاد خدا اور خدمتِ خلق سے
 جو بھی وقت بچتا اسے رزقِ حلال کی سعی و حصول میں گزارتے، عبادت
 ریاضت، صبر و قناعت، حزم و انقار اور شدید مجاہدہ نفس بالخصوص
 فضل خداوندی کی بدولت آپ کا شمار خالصانِ خدا اور اس کے مقبول ترین
 بندوں میں ہونے لگا۔ لوگوں کی نگاہوں میں آپ کا احترام اور شدید تر ہو گیا
 دوسرے طبقے کے مشائخین میں آپ کا شمار ہے۔ ابو بخش حداد،
 ابو تراب بخش، ابو عبد اللہ ذراع بصری، ابو حفص نیشاپوری، ابو عبید
 بصری قدس اسرار ہم وغیر ہم کے بمعصرو ہم صحبت ہیں۔ حضرت ابو عثمان
 جبری کے پیروم شدہ ہیں۔ مکمل یا بیس سال تک طبیعت کے تقاضے

پر نہیں سوئے، آنکھیں جب نیند سے بوجھل ہونے لگتیں تو آپ ان میں نمک
 بھر لیتے۔ چالیس سال کے بعد ایک بار سوئے تو خواب میں حق تعالیٰ شانہ کو دیکھا
 عرض کیا مولیٰ میں نے تجھے بیداری میں بہت تلاش کیا مگر تجھے خواب میں
 پایا۔ بد آئی کہ یہ اسی بیداری کا معاوضہ ہے پھر تو آپ نے سونے کو اپنا
 معمول بنالیا کہ شاید پھر اسی بہانے سے جلاوہ بے نیاز کا نظارہ ہو جائے۔ آپ اپنے
 خواب پر اس قدر فرحان و نازاں و شاداں تھے کہ فرمایا کرتے تھے: اگر دونوں
 جہان اس خواب کے بدلے مجھے عطا کیا جائے تو بھی مجھے منظور نہیں۔ اس
 مقدس اور عظیم ترین خواب سے جب بیدار ہوئے تو یہ شعر اپنی زبان
 پر جاری تھا ہے

سَأَيْتُكَ فِي الْمَنَامِ مَسْرُورًا عَيْنِي
 فَاجَبَّتْ التَّعْيِشَ وَالْمَنَامَا

”اے میرے چشم مسرت کے سہانے میں تجھے خواب میں دیکھا اسی
 لئے اب سونے اور آرام کرنے کو دوست رکھتا ہوں۔ پھر جب دیکھا آنکھیں
 بند کئے پڑے ہیں۔ دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ سو رہے ہیں۔ حالانکہ ان
 سے مقصد صرف مشاہدہ حق تعالیٰ شانہ ہوتا ہے۔ گویا مجنوں کے اس شعر
 کے مطابق ہے

وَلَا يَفِي لَا مَسْتَضِي وَمَسَالِي عَيْشَةٍ
 لَعَلَّ خِيَالَانِكَ يَنْتَقِي سِيَالِي

”میں خود کو بے خودی (یعنی سونے) کی حالت میں رکھتا ہوں۔ حالانکہ
 سوتا نہیں۔ صرف اس امید پر آنکھیں بند ہوتی ہیں کہ تمہارا سراپا لے ناز
 ہی میرے تصور کو آباد کرے۔“

اُن کی آمد کا تصور روح پرور ہے مسک

دیکھے کب ٹوٹا ہے یہ طلسم استعار

یعنی معاذ رازی کی کتاب غنا کی فضیلت کے رد میں آپ نے فقر کی
فضیلت لکھی اور بلائیں اسن ثابت کیا کہ فقر غنا سے افضل ہے آپ کی تصانیف
میں «مرآة الحكماء» کافی مشہور ہے۔ حضرت ابوحنیفہ نیشاپوری سے قیمتی
قبائیں ملبوس کوئی سوال پوچھا آپ نے فرمایا خدا کی قسم تو شاہ ہے! شاہ
شجاع نے عرض کیا جی ہاں میں شاہ ہوں کیونکہ ایسا سوال میں ہی کر سکتا
تھا۔ فرمایا تم شاہ ہو اور قیمتی قبائیں ہا شاہ نے جواب دیا وَجَدْتُ نَارِي
الْقَبْلَةَ مَا ظَلَبْتُ فِي الصَّبَاءِ جَسَّ كُدْرِي فِي تَلَاسُّسِ كَيْفَ اَسَّ قَبَائِيں پايا۔
ایک دن شاہ شجاع مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سائل نے دو سیر روٹی
کا سوال کر دیا۔ آپ کے ساتھ اور کسی بہت سے لوگ بیٹھے تھے مگر کسی نے سائل
کا سوال پورا نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کون ہے جو دو سیر روٹی کے بدلے میرے
پچاس حج خریدے، مجلس میں ایک عالم دین بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں یہ بات
بہت ناگوار معلوم ہوئی انہوں نے کہا شیخ محترم! حج اسلام کا ایک اہم
رکن ہے اس کی یہ بے توقیری، استخفاف شریعت ہے۔ دو سیر روٹی میں
پچاس حج، ہرگز نہیں! جب مجھے خود ہی اپنی قیمت نہیں معلوم تو میرے عمل و
کردار کی قیمت کیا ہوگی؟

حضرت یحییٰ بن معاذ ایک زبردست خطیب اور وعظ گو تھے۔ آپ کے
وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔ چنانچہ نیشاپور میں آپ نے بڑا پر تاثر وعظ کہا۔ جس
میں سات آدمی جاں بحق ہو گئے۔ «ہزی» ایک مقام کا نام ہے۔ حاکم
ہری کی لڑکی کی فرمائش پر آپ نے چار دن و باں پر وعظ کیا۔ آپ کے

وعظ کا ایسا اثر ہوا کہ چار دن میں ۴۵ آدمی آپ کی مجلس وعظ میں جاں بحق ہو گئے
 یہی یحییٰ بن معاذ حضرت شاہ شجاع کے گہرے دوستوں میں تھے۔ اتفاق سے
 کسی شہر میں دونوں جمع ہو گئے۔ حضرت یحییٰ نے آپ کو اپنی مجلس وعظ
 میں شرکت کی دعوت دی لیکن آپ تشریف نہیں لے گئے ان کے تالیف
 قلب کے لئے ایجاہر ان کی مجلس وعظ میں تشریف لے گئے۔ ان کی لاعلمی
 میں چھپ کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ اس وقت حضرت یحییٰ وعظ گوئی میں
 مشغول تھے کہ اچانک زبان بند ہو گئی۔ کوششیں بسیار کے بعد بھی جب
 زبان نہیں کھلی تو فرمایا کہ شاید اس مجلس میں مجھ سے بہتر کوئی واعظ موجود
 ہے کہ جس کے تصرف نے میری زبان بند کر دی ہے۔ یہ سن کر آپ سناٹے
 آئے اور فرمایا کہ میں اسی وجہ سے آپ کی مجلس وعظ میں شریک نہیں ہونا
 چاہتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اہل فضل و ولایت کا فضل و ولایت اسی
 وقت تک قائم رہتا ہے کہ جب تک وہ اپنے کو صاحب فضل و ولایت تصور
 نہیں کرتے۔ فرمایا کہ فقر ایک بہتر الٹی ہے۔ فقر جب تک اسے پوشیدہ
 رکھتے ہیں امین ہوتے ہیں اور جب اظہار کر لیتے ہیں تو ان سے
 فقر چھین لیا جاتا ہے۔ فرمایا صدق کی تین علامتیں ہیں۔ اول دنیا سے
 نفرت۔ دوم مخلوق سے دوری۔ سوم جو ابشتات نفس پر غلبہ فرمایا
 کی تین علامتیں ہیں۔ ترک شکایت، صدق رضاء، اول قبولیت رضاء فرمایا
 میری مثال اس زندہ مرغ سی ہے جس کو سیخ پر لگا کر آگ پر رکھ دیا جائے
 اور چاروں طرف سے آگ لگا دی جائے

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر جنت کا
 یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

زندگی حسب معمول رواں دواں تھی۔ منہ و نجوم کی گردش بھی اپنی جگہ جاری و ساری تھی کہ ایک دن مصافحات کی اسی بستی میں کہ جس میں آپ کا گھر تھا، ہٹوپچو کے شور کے ساتھ شاہی سواری بڑے گرو فر اور شاہانہ طمطراق کے ساتھ آپ کے معمولی مکان پر اتری۔ سلطان نے بڑھ کر دست بوسی کی سعادت حاصل کی اور ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ گیا۔ شاہی سواری دیکھ کر آپ کو بڑی وحشت ہوئی مگر بادشاہ کی سعادت سے آپ کو خوشی ہوئی دوران گفتگو بادشاہ نے ادب اور قرینے کے ساتھ عرض کیا تا یا حضور ایک طویل عرصہ ہوا ہم لوگوں سے آپ کو جدا ہوئے مگر کسی آپ نے ملاقات کے لئے بھی قدم رنج نہ فرمایا۔ آخر ہم آپ کے حقیقی عزیزوں میں سے ہیں ہمارا تو بھی ایک ہی ہے۔ اس پر بھی نہ تو آپ نے خود پلٹ کر خبر لیا اور نہ ہی اپنے احوال کی خبر ہونے دی۔ ابا حضور نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ وراثت میں یہ حکومت مجھے ملی ہے لیکن مجھے یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اس پر اصل حق آپ ہی کا ہے۔ آپ جب چاہیں واپس تشریف لائیں۔ مجھے انشاء اللہ تعالیٰ آپ ایک سعادت مند بیٹا پائیں گے۔

کیسے کروں میں بتا ترک تعلق کا یقین
تیری یادوں سے ابھی بوئے وفا آتی ہے

آپ نے جو ابنا فرمایا بیٹا! جس حکومت کو میں نے ایک بار لات مار دی اس کے متعلق اب سوچنا ہی فضول ہے۔ اس عذاب سلسل کو بہت کچھ سوچ کر میں نے چھوڑا تھا اور میں اپنے اس فیصلے پر آج بھی خوش ہوں۔ لہذا اب اس کا ذکر ہی بے کار ہے۔ یہ تخت و تاج اور شوکت اقتدار تمہیں مبارک ہو۔ دوران گفتگو بادشاہ کی نظر ایک سرود قد لار خا

من فروزاں پر پڑی۔ فدیافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی وہی چچا زاد بہن ہے
 جو شاہی محل میں پیدا ہوئی تھی جو نہ صرف یہ کہ شہزادی تھی بلکہ حسن و دلکشی اور
 جمال و زیبائی کی بھی شہزادی تھی جو سیرت و اطوار، اخلاق و عبادت،
 عبادات و ریاضات اور توکل و استغناء میں اپنے باپ کا عکس جیل تھی۔
 مصحف رُخ کسی کا ہے کہ یہ سیاحی کا قاف

ایسے چہرے سے تو بس غالب نکالی جائے

بادشاہ کو وہ شہزادی بہت پسند آئی۔ اس کے حیران کن حسن سے
 وہ بہت متاثر ہوا۔ اس کا دل پہلو میں ڈھرنے لگا۔ بڑی شائستگی اور نجاست
 کے ساتھ کہنے لگا۔ چچا حضور! آپ تو اس شہت پسندنگی کے قافی
 ہو گئے ہیں تو اپنے ساتھ انھیں کیوں شہت پسندی میں گھسیٹے ہوئے ہیں
 اگر آج آپ خود تشریف نہیں لے چکے ہیں تو کم از کم چچا حضور اور شہزادی
 عالیہ کو شاہی محل میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں جہاں پر ہر طرح
 کی آسائشیں ان کی منتظر رہیں۔

کیسی باتیں کرتے ہوئے اس بات کو میں نے اپنے لئے پسند
 نہیں کیا اسے اپنے اہل و عیال کے لئے میں کیوں کر پسند کروں گا؟ اور
 ہمارے بیوی بچے اپنا اس زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔

تو چچا حضور! تم نے بعض اُن کے اقدام کے خیال سے عرض کیا کہ
 کوئی دل شکنی مقصود ہو اطر نہیں تھی۔

بیٹا! جس بات کو ہم بھولی گئے اس کا تذکرہ ہی عبت ہے۔
 بادشاہ بڑا مضطرب تھا۔ ہر دم وہ سروقد، سینیں تن، نانک
 بدن، غمخوہ دہن، آہو چشم، لالہ رخ، خوبصورت ترین پرتقدس سراپا

نگاہوں میں گھومتا رہا ہے

بِروقت ایک حسین تصور میں گم ہوں

جلوے کسی کے کیا میری آنکھوں میں بس گئے

حسن کی قوت تسخیر تو ایک مسلہ امر ہے اور جب اس میں معنوی
تقدّس کی آمیزش ہو جائے تو وہ بڑا محترم اور پاکیزہ پاکیزہ سا ہو جاتا ہے۔ نوجوان
بادشاہ کی جوان دھڑکنیں اس سرِ پائے ناز کے تصور سے مربوط ہو کر زہمیں
اب دن رات اس فروزاں حسن کے جلوے اپنے گرد و پیش بکھرے محسوس
ہوتے تھے

اب تو ہر سمت کھلے ہیں تیری یادوں کے گلاب

دل کے دیرانے میں یہ بات کہاں تھی پہلے

گوہر مقصود کے حصول کے لئے اپنے دل بیتاب کے ہاتھوں مجبور ہو کر
بادشاہ نے اپنی والدہ کے ذریعے شاہ شجاع کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا
شاہ شجاع نے بادشاہ کے اس پیغام کو خوبصورتی کے ساتھ ٹالنے کی بڑی
کوشش کی مگر عورت ذات اور وہ بھی حقیقی بھائی کی بیوہ کے سامنے ایک
ذلیل سی۔ سلطان کی والدہ کے شدید لہرار پر آپ نے اس نازک مسئلے میں
غور و فکر کے لئے تین دن کی مہلت مانگی۔ بادشاہ کی ماں نے کہا بھائی جان
آپ چاہے جتنے دن کی مہلت لیں مگر میں جواب میں ہاں ہی سننا چاہتی
ہوں۔ میں ہر قیمت پر اپنی بیٹی کو شاہی محل میں لے جا کر رہوں گی۔ یہ بہت
دن آپ کے ساتھ مشقت جمیل تھی۔ اپنی فطری و پیدائشی حق کیساتھ
ہی ساتھ اپنی گوناگوں خوبیوں، بے پناہ حسن و جمال اور تسوانی و قار و تمکنت
کی بدولت اب شاہی محل ہی اس کا صحیح مقام ہے۔ سلطان کی والدہ

کے جانے کے بعد آپ کو بڑی فکر ڈالنی ہوئی کہ وہ اپنی عابدہ، زاحدہ، صابریہ اور
 انتہائی نیک و سعادت مند بیٹی کے لیے کیا کریں۔ جو چیز انھیں خود پسند نہیں تھی
 وہ اپنی اولاد کے لیے کوئی پسند ہو سکتی تھی۔ جس بستی میں آپ کا قیام تھا
 وہیں ایک چھوٹی سی مسجد بھی آپ نے بنا رکھی تھی جس میں آس پاس کے لوگ
 اگر نماز پڑھتے تھے۔ انھیں میں ایک غریب خدا مست پر سیز گار نوجوان بھی تھا
 اپنے اخلاق و عادات اور حسن عمل کی بنا پر وہ آپ کو اچھا لگتا تھا۔ نماز
 میں مشورع و خضوع اور طویل سجدوں کی وجہ سے وہ آپ کی نگاہوں میں
 محترم تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد دل میں ایک حتمی فیصلہ کر کے اٹھے۔ سب کے
 پہلے مسجد میں گئے۔ حسن اتفاق وہی نوجوان جو تھوڑی دیر پہلے آپ کا مرکز
 تصور تھا۔ مجبور حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز نظر آیا۔ آپ جا کر اس کے
 پاس بیٹھ گئے۔ کافی دیر کے بعد اس نے نماز ختم کی۔ اس نے بڑھ کر سلام
 کیا۔ سلام و دعا کے بعد خیریت دریافت کی اور گفتگو کا سلسلہ ختم
 دیا۔ اٹھائے گئے آپ نے اس سے دریافت فرمایا "صاحبزادے کیا شادی
 شادی شدہ ہو؟" نوجوان نے اٹب کیساتھ جواب دیا۔ "نہیں۔"

"شادی کرنا پسند کرتے ہیں؟"

"میں ایک مفکر احوال اور بے حد غریب ہوں۔ بسے کسٹال

آدمی کو کون اپنی بیٹی دینا پسند کرے گا؟"

نوجوان! اگر پسند کرو تو میں اپنی بیٹی دینے کے لئے تیار ہوں۔"

تمیز خیز مسرت کے عالم میں رزتے ہوئے نوجوان نے عرض کیا: حضور والہ

یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ کہاں آپ اور کہاں میں؟ مجھے اچھی طرح سے

معلوم ہے کہ آپ ہی اس ملک کے حقیقی فرمان روا ہیں۔ اور آج بھی شاہی

سواری آپ کے دولت کدے پر آئے دن اترتی رہتی ہے۔ آخر ایک شہزادی اور ایک بے نوا فقیر کا کیا جوڑا؟ چھ نسبت خاک رابا عالم پاک؛ عمل میں ٹاٹ کا پیوند؛ بھلا یہ شادی بھی کہیں کا میاب ہو سکتی ہے؟ اور پھر ایک شہزادی کب ایک کنگال کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر سکتی ہے۔

نوجوان! جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی اپنی جگہ پر درست ہے۔ مگر وہ میری بیٹی ہے۔ اس کی سعادت سے مجھے امید ہے کہ وہ میرا فیصلہ بڑی خوشی کے ساتھ قبول کرے گی۔ پھر اگر تم تیار ہو تو اس سلسلے میں کوئی قدم آگے بڑھاؤں۔ شریعت کی رو سے آخری فیصلہ تو اسے ہی کرنا ہے:

آپ کی غلامی میرے لیے بڑی سعادت ہوگی۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ میرے غربت کدے کا ماتول شہزادی کا طبع نازک برداشت نہ کر سکتا۔ جگ ہنسائی ہو ہوگی سو ہوگی ہی میرا فقر و فاقہ الگ رسوا ہوگا اور سہراہ میری غربت نشانِ تضحیک بنے گی۔

غموں کی دھوپ میں کاٹا ہے زندگی کا سفر

کوئی شجر میرے رستے میں سایہ دار نہ تھا

نوجوان! تو بجا اندیشے سے اپنے آپ کو ہلکان مت کر۔ ایک بار جب میں نے کہہ دیا کہ وہ میری بیٹی ہے اور اسے تجھ سے زیادہ میں جانتا ہوں تو خاطر جمع رکھ اور اپنے رب پر بھروسہ رکھ وہ جو بھی کرے گا بہتر ہی ہوگا۔ یہ بتا کہ تیرے پاس کچھ رقم ہے؟

”جی ہاں! صرف تین درہم“

”کافی ہے۔ ایک درہم کی روٹی، ایک درہم کا سالن، اور ایک درہم کا خوشبو خرید لینا“ مسجد سے واپس آ کر اپنے بیوی سے

اس نوجوان کا ذکر کیا اور فرمایا میں چاہتا ہوں کہ اس تین دن کے اندر احمد
 اپنی بیٹی کا نکاح اس نوجوان سے کر کے زحمت کر دوں۔ میں بادشاہ کا فرستہ
 کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا۔ جس بادشاہت کو میں نے لات مار دی اس کو
 اپنی اولاد کے لئے کیونکر پسند کر سکتا ہوں۔ تمہاری اس بابت کیا رائے ہے؟
 پیکر وفا اور نیک بختی سے جواب دیا: "بیٹی کے حق میں آپ
 جو فیصلہ کریں گے وہ ہر حال میں بہتر و مناسب ہو گا۔ مگر ایک زبان بیٹی سے
 بھی دریافت فرمائیں اور ایسی صورت میں یہ اجازت اور بھی ضروری ہو جاتی
 ہے جبکہ اس کے کان میں شاہی رشتے کی جھنجک پڑ چکی ہے۔"

ہاں ہاں! اس سے پوچھنا تو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اسلام نے
 بالغ لڑکی کو اتنا اختیار تو دیا ہی ہے کہ والدین یا اولیاء اگر زبردستی اس پر
 اپنا فیصلہ دل پسند مسلط کرنا چاہیں تو اسے وہ مسترد کر سکتی ہے اس نازک
 اور اہم ترین مسئلے میں خود دو ٹوک اس سے بات کرنا پڑے کر دوں گا
 ہاؤ تم کسی بہانے سے میرے پاس بھیج دو۔
 "آبا حضور! آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے؟"

"ہاں بیٹی! بیٹھ جاؤ۔ ایک نازک مسئلے میں تمہارا مشورہ بہت ضروری
 ہو گیا ہے میں نے براہ راست تم سے گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ بیٹی! بات
 دراصل یہ ہے کہ بچہ تعلقہ تم اب عمر کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہو
 جہاں پہنچ کر والدین کو اپنی بیٹی کے لئے بہتر مستقبل کی فکر ہونے لگتی ہے
 اور والدین کو نکاح کے پیغام ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میں تمہاری طرف سے
 غافل نہیں تھا بلکہ اپنے حسبِ حال کسی مناسب رستے کا منتظر تھا کہ بے شان
 و گمان بادشاہ کی والدہ تمہارے لئے سلطان کا پیغام لے کر آئیں جس کا

کسی حد تک تم کو بھی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ میں ذاتی طور پر اس رشتے کے حق میں نہیں۔ میں نے خوبصورتی کے ساتھ اس رشتے سے بچنے کی بڑی کوششیں کیں لیکن سلطان کی والدہ نے اپنی قرابت داری اور خون کی دہائیاں کچھ اس انداز سے دینے لگیں کہ صاف لفظوں میں انکار کرتے نہیں بنا۔ اور وہ پھر اپنی بات کے علاوہ دوسرے کی کچھ سُننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ ہر حال میں تمہیں اپنی بہو کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے غور و فکر کے لیے تین دن کا وقت لیا ہے کہ ان تین دنوں میں سوچ کر جواب دوں گا۔ انہوں نے چلتے چلتے بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ آپ چاہے جتنے دن کا موقع لیں فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہئے۔ میں اپنی بیٹی یعنی تمہیں ہر حال میں شاہی محل میں لے جا کر رہوں گی۔ بیٹی! شاہی محل اور بادشاہی ایک خواب ہے عوام کے لئے۔ لیکن کوئی بچہ سے پوچھے میں اسے تعبیر چکا ہوں وہ روح کے لیے ایک مستقل آزار ہے۔ میں ایک ضائع متقی اور متوکل مگر بہت غریب نوجوان کو جانتا ہوں۔ وہ نوجوان تعوی اور پرہیزگاری اور عبادت گزار کی کے باعث مجھے پسند ہے۔ تم بادشاہ اور اس غریب مگر پرہیزگار نوجوان میں سے جسے پسند کرنا سے اپنے فیصلے سے مجھے جلد آگاہ کرو۔ انہیں تین دنوں میں مجھے تمہارے متعلق کوئی بڑا اور حتمی فیصلہ کر ڈالنا ہے۔

شہزادی اپنی شادی کے ذکر پر شرم و ندامت سے سرخ ہو گئی
 رُکی کی شرم ہی تو اس کا اصل سُن ہے۔

کتنے رنگین تصور کی منابندی ہے

بوئے گل، لالہ دل، دونوں ہمن سے گزریے

شہزادی بڑے قرینے سے انگ انگ اور جھمک جھمک کر کہنے لگی ابا حضور!

جو آپ کو پسند نہیں تو کیا آپ کو یہ امید ہے کہ آپ کی بیٹی اسے پسند کرے گی۔ جو
چیز آپ کی روح کا آزار ہے وہ رُوح کی بہاروں کا موسم کیسے بن سکتا ہے؟
آپ کی پسند ہی میرا سرمایہ حیات ہے۔

اہل وفا کے باغ سے پھوٹی نہیں اگر

خوشبو کہاں سے آئی یہ شاخ گلاب میں

سبحان اللہ! جزاک اللہ! تمہاری سعادت مندی سے مجھے ہی

امید تھی کہ خدا کے پاک وعدے نیاز تمہیں دالین کی خوشیاں میسر فرمائے۔
شہزادی خاموشی سے اٹھ کر باپ کے پاس سے چلی گئی۔

دوسرے دن محلہ کے معززین کے سامنے شاہ شجاع نے اپنی خوب

اور سعادت مندی بیٹی کا نکاح اس غریب نوجوان سے کر دیا۔ نکاح کے بعد

بیٹی کو دولہا کے ساتھ اسی رات رخصت بھی کر دیا۔ خاموش مسرتوں کے

ہجوم میں شہزادی نے جملہ عروسی میں قدم رکھا۔ آرزوئے شوق کی گما

گمی میں اپنے تنگ دامن میں دونوں جہان کی خوشیاں سمیٹے دُنیا کا

خوش نصیب ترین دولہا بھی ساتھ میں تھا۔ وہ بہن شہزادی سنے

ایک شان استغناء سے اپنے گروہ کپٹین پر نظر ڈالی۔ کمرے کی حالت دولہا

کے غرت و بے سرو سامانی کی تصویر تھی۔ اس فلاکت زدہ کمرے میں جوں

جوں شہزادی کی نظر ادھر سے ادھر ہوتی۔ غریب دولہا کے دل کی

دھڑکنیں بڑھتی جاتی تھیں اور چہرے پر اپنی کم نائیگی اور بے سرو سامانی

کا احساس نمایاں ہو جاتا۔ اپنی حیثیت اور شہزادی کی عظمت پر ہر سال

اور اس کے حسن و جمال سے بہوت صورت حال کی نزاکت نے اس کے

دل کی دُنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

اب تو آنکھوں کی سچ پر ہم دم
 سارے منظر ترے وصال کے ہیں
 بالآخر شہزادی کے نظروں کی گردش کرے کے ایک گوشے میں لکھے
 ہوئے پانی کے ایک برتن پر ٹھہر گئی۔ ایک اداسے بے نیازی کے ساتھ جنبش
 لب نغمہ بار ہوا۔

” وہ کیا ہے ؟ “
 ” پانی کا گھر جس کے اندر پانی بھرا ہوا ہے۔
 ” گھر بے پر کیا ہے ؟ “

” ایک روٹی کا آدھا ٹکڑا۔ نصف کھالیا ہوں اور نصف کل کے لئے بچا
 یا ہوں۔ یہی میری کل پونجی ہے۔

یہ سن کر شہزادی کے بے حد حسین چہرے پر گردِ طلال ظاہر ہوا۔ طبع نازک
 کبیدہ خاطر ہوا۔ چمن کی ہیر گلی کو شرطنے والی لہجوں نوازہ تبسم شرابار ہوا۔ ایک
 جھٹکے کے ساتھ دو لہا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ” مجھے ابھی میرے باوی
 خان کے گھر واپس پونچا دیکھئے۔ یہ آواز کیا تھی۔ اس کے آرزوؤں
 کے حسین عمل میں ایک دھماکہ تھا۔ تمناؤں کی بارات تو ابھی سچ ہی رہی
 تھی۔ انگلیں ولولے شاد کام حسرتوں میں تبدیل ہونا ہی چاہتے تھے کہ
 اچانک یہ کیا ہو گیا ؟

نوجوان خواں بانگھی کے عالم میں بڑے درد کے ساتھ لرزتی آواز میں
 عرض کتاں ہوا : قابلِ احترام شہزادی یہ کیا سن رہا ہوں ؟ یہ بیداری
 ہے یا خواب ؟ ” آپ جو کچھ سن رہے ہیں بیداری کے عالم ہی میں
 ہیں اور صبح سن رہے ہیں ایسا پھر سن لیجئے کہ مجھے اپنے باپ کے گھر

ابھی واپس پہنچا دیکھے۔ میں ہر حال میں آج ہی اپنے والد گرامی تک پہنچنا
چاہتی ہوں۔“

نوجوان درویش نے بڑے کرب کے ساتھ کہا ”شہزادی عالیہ! اتنی بڑی اور
کڑی ہنرا، میں کس جرم کی پاداش میں دے رہی ہیں آپ؟“
خدا شاید بے کہ میں نے آپ کے یا آپ کے والد کے ساتھ کوئی دھوکہ کوئی فرا
نہیں کیا۔ ان پر اپنی غربت و بے سروسامانی نہیں چھپانی۔ حد یہ ہے کہ میں خود
سے آپ کے تصور کا مجرم بھی نہیں۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے بار بار میں نے
اپنی غربت و افلاس کا حوالہ دیا۔ اس بے جوڑ شادی کے انجام کو بھی ان کے
سامنے رکھا کہ کہاں میری فلاکت زدگی اور کہاں ایک بے مثال شہزادی؟
میرے غربت کدے کا ماحول شہزادی کا طبع ہلکا نہیں برداشت کر سکتا گا
مگر وہ نہیں مانتے۔ آپ کی سعادت مندی اور اس قدر کا خطہ پڑھتے رہے کہ
وہ ہر حال میں زراعتی بددھار سے والی بڑکی ہے۔ تم مطلقاً اندیشہ نہ کرو۔
میں مسلسل یقین دہانیوں پر میں نے اتنی بڑی حماقت کی جو ات کی تھی۔
گناہس! مجھ سے اتنی بڑی غلطی سرزد نہ ہوئی۔ عمل میں ٹاٹا کو بھونکا جو
شہر ہوتا ہے۔ آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ اپنے والد ماجد
کے کے ہوئے کی سزا اس غریب دنیاوان کو نہ دیں۔ آج ہی میری شادی
ہوئی ہے۔ آج ہی آپ نے دوہن بن کر میرے قریب کدے میں قدم رکھا ہے
مگر مجھے ایک آفاقی خوشیوں سے آشنا کیا ہے۔ یہ ہماری ایسے ارضی
سہاگ رات، ہے سے

یہ قربت کے لمحات اگر بھول بھی جاؤں
برسوں مجھے تڑپائے گی احساس کی خوشبو

اگر آج ہی آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو یہ شادی زندگی بھر کے لئے
 ایک سزا بن جائے گی۔ سردارہ میری محرومیوں کا مذاق اڑایا جائے گا۔ میرا فقر و
 فاقہ رسوا ہوگا۔ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ میری عرضداشت پر غور فرمائیں
 مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ آپ حسن صورت و سیرت دونوں میں منفرد اور عام
 سطح سے بالاتر ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شاہی رشتے کو مسترد
 فرمادیا ہے۔ میں اپنے نصیب کی ارجحندی پر فرماں اور اپنی فیروزہ بخشی پر نازوں
 تھا کہ مجھ بے نوا کو ایک بادشاہ پر ترجیح دیا گیا۔ آہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ
 تصورات کے یہ حسین محل آن واحد میں زمین بوس ہو جائیں گے۔ جب گنتی
 آنکھوں سے جو خواب دیکھا تھا وہ سراب محض ہوگا۔ ہلے کس درد کے
 صحرایں تنہا بھٹکنے کے لئے مجھے چھوڑ رہی ہیں آپ سے

یاس کی نیند سلانا اگر تھا، ہی منظور
 میری امید کی زاتوں کو جگایا کیوں تھا

”میرے سرتاج! آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ کو ہمیشہ کے
 لئے چھوڑ کر نہیں جا رہی ہوں۔ میرا مستقبل آپ کے ساتھ تو میری ہی مرضی سے
 وابستہ ہوا ہے۔ میرا مزاج جینا اب آپ ہی کے ساتھ ہوگا۔ میں سزا و سزا لپنے
 عظیم باپ سے یہ پوچھنے جا رہی ہوں کہ آپ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ تمہارا
 بچاؤ ایک مستحق پرہیزگار اور متوکل مگر غریب و نادار نوجوان سے کرنا چاہتا ہوں
 اسی بنیاد پر میں نے بادشاہ کے پیغام کو مسترد کر دیا تھا۔ والد گرامی سے
 یہ پوچھنا ہے کہ رشتے کی منظوری لیتے وقت آپ نے غلط بیانی سے
 کیوں کام لیا۔ آپ کو بادشاہ کے بجائے یہی نوجوان پسند تھا تو آپ
 میں صرف حکم دیتے۔ تقویٰ اور توکل کا فریب کیوں دیا؟ جس شخص کو

رزاق مطلق پر اتنا بھی بھروسہ نہیں کہ جس نے اپنے فضل سے رزق عطا فرمایا ہے وہی کل بھی دے گا جو آدمی رزق کا تاج کھاتا ہے اور آدمی کل کے لئے بچا رکھتا ہے کہ پتہ نہیں کل روزی ملتی بھی ہے کہ نہیں؟ وہ صاحب تقویٰ ہو تو کل کیوں ہے اتنا بھی بھروسہ نہیں کہ وہ رزاق کل بھی روزی دے گا اسکے متعلق یہ کیسے یقین کر لیا گیا کہ وہ پر سیز گار متوکل اور خدا رسیدہ ہے؟ افسوس تو اس بات پر کہ جسکی وجہ سے شاہی رشتہ ٹھکرا یا وہ یہاں سر سے ناپید ہے۔ میں اپنے باپ کے وہن کو پکڑ کر جنھوڑوں گی کہ اپنے مجھے ایک ایسے شخص سے کیوں بیاہ دیا جسکے پاس توکل استغناء اور پر سیز گاری نام کی کوئی چیز نہیں۔

شہزادی کے خوابے نوجوان درویش سناٹے میں آ گیا۔ شرم وندامت کے ڈوبنا آواز میں بجز و در ماندگی کیسا کھڑا عرض گزار ہوا۔ عظیم پاپ کی عظیم بی بی آپ کے متعلق میں اوجھے انداز فکر پر بہت نادام اور سناٹا تھی معافی کا تو اسے سنگار ہوں۔ تقویٰ و پر سیز گاری توکل و استغناء کے جس مفہوم سے اپنے مجھے آشنا کیا ہے بیشک یہ شاہ شجاع کی شہزادی ہی کا حصہ ہے اور ان کی تربیت خواص کا طرہ امتیاز! یہ رونی اتنا بڑا فتنہ ثابت ہوئی مجھے نہیں معلوم تھا اور ایک طرح اچھائی ہوا کہ اسی کی بدولت تقویٰ و توکل کے ایک نئے بہترین روپے روشناس ہوا۔ یہ بیکریک جھنگ سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خالی ہاتھ واپس آیا کہ میں نے اسے ایک فقیر کو خیرات کر دی ہے یہاں آپ کا بھدہ منوں کر ہوں کہ آج آپ مجھے توکل کی اصل حقیقت سے آشنا کیا۔ شہزادی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک دن نواز بستم کے ساتھ منہ سے اپنے شوہر کی طرف جنت پا داس نظروں سے دیکھنے سے

بستم اور پھر ان کے لبوں کا بزم چمن کی برکی شہزادی ہے

مہتمم کا پندرٹ

ہندوستان کا قدیم مذہبی شہر مہتمم امرلی والے ریشن جی کے تمام پندرٹ ریشن ہوتے کی وجہ سے ہندوؤں کا مرکز عقیدت تھا۔ مہتمم کی تاریخی حیثیت جو بھی رہی ہو مگر ریشن جی اور ان کی گوپوں نے اپنی مذہبی حیثیت سے شہرت دینے میں نمایاں رول ادا کیا اور آج بھی ہندوؤں کی نظریں اس کا افسانوی فتنہ س برقرار ہے۔

ریشن مراری کے اسی مشہر میں ایک انسان ہفتوں سے بھٹکا پھر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے متاعِ گمشدگی تلاش ہے سلبا کرتا چہرے پر گھنی وارٹھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے ہیں، اسکی متوش اور تجسس نگاہیں صبح سے شام تک بلند مقامات اور ان کے دروہام پر پھلتی رہتیں اور کبھی کبھی بے چینی کے عالم میں آہ سرد کیساتھ پردہ آواز میں یہ پڑھتا نظر آتا ہے

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست
دورہ کد ام فتنہ گراست وزمان کیست

خوش نصیب! موسم بہار کی ایک صبح اپنے دامن میں مستروں کے نزلے سمیٹے طلوع ہوئی۔ چند بردہ جینوں کا ایک جتھا خرام ناز سے چلتا ہوا شہر سے چلتا ہوا شہر سے باہر نکلا۔

بڑے ناز، بڑے انداز، بڑے مگنت کے ساتھ! دلربائی کا تمام تر بائبلن لے ہوئے
 قدم قدم پر محشر بپا کے ہوئے۔ لگتا ایسا تھا کہ گوسپیاں اپنے رونے ہوئے
 کرشن کو منانے کے لئے ناز و ادا کے اسلے سے مسلح ہو کر نکلی ہیں۔

الہر دو شیراؤں کی اس گروہ میں «لاجوتی» کی حیثیت سب سے
 نمایاں تھی۔ قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اسے حسن کی دولت سے نوازا
 تھا۔ سر و قد، لمبی سیاہ زلفیں، ساون کی اٹھتی ہوئی گٹھاؤں کی طرح،
 خوبصورت پتلے پتلے ہونٹ، شہابی چہرہ، مسکراتی آنکھیں، گھنے ابرو،
 جب لکھلا کے منستی تو اسکے چہرے پر شفق کے رنگین لہرے پھوٹ پڑتے اور
 جب وہ ایک ادلے تار سے اپنے آنچل درست کرتی تو حیات کی دھڑکنیں
 رکتی ہوئی محسوس ہوتیں اور جانے کتنے بوڑھے جوان سسکیاں لینے
 لگتے غرور حسن نے کنیاؤں کو اپنے ماسوا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ آگے پیچھے
 دیکھ کر چلنا بھی انھوں نے اپنی بے نیاز یوں کی توہین سمجھا۔ باہم اٹھکیلیاں
 کرتیں، شاخ گل کی طرح لچکتی چلتی منستی ملی جا رہی تھیں کہ اچانک سربراہ
 متھرا کی گلیوں میں وہی ہنستوں بھگنے والا اجنبی مسافر آگیا اور بڑی حسرت
 و افسوس کے عالم میں «لاجوتی» کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا۔

خوش روئی و عالی تن ہے

سرد ہے و آہے یک تنگ ہے

معلوم نہیں اور لڑکیوں نے اس شعر کا مطلب سمجھایا نہیں

«لاجوتی» تڑپ اٹھی۔ بھوکے شیرنی کی طرح دھاڑتی ہوئی بونی بٹھے میاں

تھیں شرم آتی چاہے کم از کم اپنے چہرے پر اس سفید دارمی کا تو کچھ خیال

کر دیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔ یہ مقرر ہے متھرا۔ جھینا

نہیں۔ چلو اپنا راستہ لو۔ اور پھر خبردار اپنا یہ منحوس تھوڑا امت
 دکھانا۔ اس طرح گرجتی برستی وہ اپنے سہیلیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گئی۔
 اس کی سکھیاں سہیلیاں حیران پریشان کبھی اس اجنبی کو دیکھتیں اور
 کبھی غیظ و غضب میں بھری ہوتی تو بصورت لاجوتی کو جس کے چہرے پر غصے
 نے اور لاویزی پیدا کر دی تھی۔

بالآخر ایک نے چلتے چلتے ہمت کر کے پوچھ لیا: اے راجہ اندر کے
 سنگھاسن کی پری! آخر اس غریب نے کیا کہہ دیا جو تم اس قدر آپے سے
 باہر ہو گئیں۔ اس نے تو صرف ایک کو تیا پڑھا تھا اور وہ بھی اپنی زبان میں
 جو ہم لوگوں کے پنے تو کچھ بھی نہیں پڑا۔ ہاں اگر تم نے کچھ سمجھا ہو تو بتاؤ
 تاکہ پھر کبھی ملے تو اس کی ٹھکانے سے خبر لی جائے۔

جیسے تم لوگوں نے کچھ نہیں سمجھا ایسے ہی میں نے بھی کچھ نہیں سمجھا
 لاجوتی نے بہت کچھ چھپائے ہوئے جواب دیا۔

پھر اسے دیکھتے اور اس کے منہ سے کویتا سنتے ہی کیوں آپے سے
 باہر ہو گئیں اور اس غریب پر اس طرح ٹوٹیں کہ وہ تھوڑی دیر میں جانے کتنی
 بار مرنے کے گیا۔ ویسے اگر تمہیں اپنی سُنندرتا کی طاقت کو آزمانا ہی تھا تو
 صرف مسکرا کے اس کی غیرت ہی پوچھ لیتیں وہ یوں ہی قتل ہو جاتا۔

گابتری جی بتم تو لگیں مذاق اڑانے۔ حالانکہ بھگوان نے تمہیں خود
 اتنی سُنندرتا دی ہے کہ اگر بہادر سے بہادر جوان کی طرف ایک غلط نگاہ ڈال
 دو تو وہ اپنا دل پکڑ کر ترپنے لگے اور چیخ چیخ کر تمہاری بے نیازی کا ماتم کرے
 کہ سے یوں ترپھی بنگاہوں سے مجھے قتل بھی کرنا

پھر صاف مکر جانا کہ میں اس سے بری ہوں

سچ جانو سکی جانیے کیوں ان موئے ترکوں کو دیکھ کر میرے تن بدن
میں آگ لگ جاتی ہے۔

ارے واہ! یہ کوئی بات ہوئی؟ ہمارے اسی شہر میں نہ جانے
کتنے ترک بستے ہیں اور وہ روزانہ بہتیرے آتے جاتے رہتے ہیں ان لوگوں
کو دیکھ کر تو ہم لوگوں کے تن بدن میں بالکل آگ نہیں لگتی۔ شاید میری ذاتی
اتہاس (تاریخ) زیادہ پڑتی ہے اور اس کی آنکھوں میں ہر ترک کے چہرے
پر غزنی کے اس پلٹھ انسان کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس نے تمہارا کو بولتے
وقت اس کی پوترتا کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔

لو تم تمہارا کو بیدار ہو۔ وہ تو تھا نیسرا اور سومنا تھ جیسی شکتی
والی تیرتھ گا ہوں کو بیدار دی کے ساتھ رووندتے ہوئے ہالے بٹے بڑے
دیوتاؤں کے قبر سے نہیں ڈرا۔ اپنے سترہ حملوں میں مارے ہندوستان کو
اکھاڑ پکھاڑ کر رکھ دیا۔ مگر یہاں کے سیکڑوں راہہ اپنی بھاری سینا کے
باوجود اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے اور وہ آٹلا ساٹھ کی طرح اکٹھ بھارت نہیں
دندنا تاربا۔ آج اپنی اتہاس پڑھتے وقت اپنے بڑے بڑے راہوں ہمارا
اور سینا پتیوں کی کا پرتا پر ہمیں جیند شرم آتی ہے۔ اس طرح وہ باہم لہتی
ہوئیں اپنے اپنے گھروں کو واپس آگئیں۔

ایک دن صبح ہی صبح روپ وئی «ووتی» کے ہی کے گھر پوچھ گئی
مابسی کو نئے کرنے کے بعد وہ سیدھے ووتی کے گھر میں پوچھی۔

ارے دیوی بی! ابھی آپ کا سونا ہی ختم نہیں ہوا؟
آؤ روپ آؤ۔ ابھی ابھی میں تمیں یاد کر رہی تھی۔ بہت دن تک جوگی
ہاں آج بہت دیر تک جاگتی رہی اسی لئے سویرے اٹھ نہ سکی۔

دھنیا باد! میں یاد تو آئی۔

یہ میرے جذبے کی سچائی ہی تو ہے کہ میں نے سچے دل سے تمہیں یاد
کیا اور تم کھنٹی ہوئی چلی آئیں سے

ہم نے ان کو تو پکارا ہے مگر اے جذبہ دل

ان پر بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لیکن یہ تم نے مانجھے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرح ایک دم سے باہر نکلنا
کیوں چھوڑ دیا؟

ہاں آج کل میں باہر کم ہی نکلا کرتی ہوں۔

کیوں؟ کیا اسی کو تیار پڑھنے والے ترک کے ڈر سے۔ ارے وہ تو بڑا

کا پر نکلا۔ تمہارے ایک ہی جھاڑ سے وہ متھرا ہے ایسا غائب ہو جیسے گدھے

کے سر سے سینک! لیکن میں یہ نہیں مان سکتی کہ اس دن کے کویتا کا مطلب

تم نہیں جانتی ہو۔ عورتوں کی چھٹی جس اگر کوئی چیز ہے تو میں یہ یقین سے کہہ سکتی

ہوں کہ اس دن کے کویتا اور تمہارے درمیان ضرور کوئی بھید ہے۔ اسے دیکھتے

ہی تمہارا ٹپڑ پچر چڑھ جانا اور تمہیں دیکھ کر اس کے آنکھوں کی مخصوص چمک اور

پھر غصے میں تمہارا یہ کہنا کہ یہ تمہارا ہے متھرا۔ جھنجان نہیں۔ اپنے پیچھے کوئی کہانی

لے ہوئے ہے۔ لاہو! میری جان کیا تم اس کویتا کے پیچھے پیچھے ہوئے بھید

پر وہ اٹھا سکتی ہو؟ میں اسی دن تم سے پوچھ بیٹھی مگر سہیلیوں کے نجوم

میں سے مناسب نہیں سمجھا۔ آج اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر ڈالو۔ عورتوں کے

تعلق مشہور ہے کہ وہ پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں مگر تم اپنی روپا کو اس کا الٹا

پاؤگی۔ اچھا بس شروع ہو جاؤ۔

روپ! تم جانتی ہو کہ میں نے آج تک تم سے کوئی بات نہیں چھپائی اور

چھپا بھی نہیں سکتی۔ تم متھرا میں میری سبک پکاری سہیلی اور میری ہمراز
 ہو۔ میں کئی دن سے خود تم سے ملنے کے لیے سوچ رہی ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی
 آگئیں۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی لیکن روپ! تم یہ بات اپنے ہی تک محدود
 رکھنا۔ یہ بات صرف ماسی کو معلوم ہے کہ میں یہاں اپنا گھر چھوڑ کر کیوں پڑی ہوں
 تمہیں کرشن بھگوان اور ان کی گویوں کی اٹوٹ محبت کی قسم جو یہ بات تم سے
 آگے بڑھے۔

ارے بگلی! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟

اچھا تو سنو! اس دن اس ترک کے کوتا اور اس کے پڑھنے کے تصور کو
 میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور اسی لیے میں اس بڑی بڑی طرح بھڑک اٹھی تھی۔
 اچھا تمہیں تاؤ کہ اس میں اور مجھ میں کتنا فرق ہے۔ میں ایک ہندوکتیا اور کیا
 وہ مسلمان ہے۔ بیسٹ سال کی میں کنواری اور کیا پالیٹس کے اوپر کا اور سنڈ
 کسی طرح کی کوئی بھی تو نسبت نہیں۔ اور بڑے میاں چلے ہیں مجھ جیسی ہندو
 راکھی پر عاشق ہونے۔

کیا کہا ہے وہ موترک تم پر عاشق ہے؟

ہاں روپ! اور عاشق بھی ایسا ویسا نہیں مجھوں، فریاد، رونا، بھانپنا
 سب کا نام تم نے ضرور سنا ہو گا۔ مگر جا رہے بڑے بڑے میاں کی شان سے
 زالی ہے۔ بڑے میاں مسلمانوں کے عزیز پیشوائے سیکڑوں ہستاروں
 لوگوں کو ان سے گیان دھیان ملا۔ یہ خود بھی بال بچے دار آدمی ہیں۔ مسرتی
 فارسی اردو کے بہت بڑے جانکار ہیں۔ سیکڑوں لوگ ان کے آگے ہاتھ
 باندھے کھڑے رہتے تھے۔ ایک بار کہیں انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ بس اسی
 دن سے دیوانے ہو گئے۔ مسجد مدرسہ گیان دھیان پر ارتھنا سبک چھوڑ چھا

بس میرے پیچھے پڑے یہاں تک کہ میرا گھر سے نکلنا دو بھنسا ہو گیا۔ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے رات دن میری نگلی کے چکر لگاتے رہتے۔ اور اکثر دھرتا دیتے پڑے رہتے۔ دنیا کی تھوک فضیلت، لغت ملامت کسی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ آزاد اور کھلتا ڈرے لوگوں کے لئے بڑے میاں اور میری ذات ایک دلچسپ کھلونا بن کر رہ گئی۔ مجھے ہدنامی سے بچانے کے لیے میرے گھر والوں نے کرشن بھگوان کے اس پوتر شہر متھرا میں مجھے اپنی ماسی کے یہاں سارا کچا چھٹا بنا کر بھیج دیا۔

میرے یہاں آجائے پر میرے گھر والوں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اور میں بھی خوش ہو گئی کہ چلو میری عزت بچ گئی۔ رسوائی جگ ہنسائی سے بھگوان نے بچا لیا۔ مگر میرے خوشی کے یہ دن بہت تھوڑے ثابت ہوئے۔ بڑے میاں یہاں بھی آدھے اور اسی دن سے میرا سکون غارت ہو گیا۔ اب رات بھر مجھے نیند نہیں آتی۔ ماسی کو بھی اس دن کے بھاؤنا کی خبر نہیں دی۔ اب تم ہی کوئی اُپا بے بتاؤ نہیں تو متھرا میں بھی میرا رہنا کٹھن ہو جائے گا۔ رام رام! یہ تو کوئی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ سچ جج تم بڑے مصیبت میں پھنس گئی ہو بھگوان تم کو اس مصیبت سے بچائے اچھا کیا جو ماسی سے بیبات نہیں بتائی ورنہ وہ تو اور بیا کل ہو جاتیں۔ تم کوئی چنتا نہ کرو یہ متھرا ہے اگر بڑے میاں سیدھی طرح راہ پر آگے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے لئے ضرور کوئی اُپا لے کیا جائے گا۔ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ ویسے میں برابر نکلتی ہوں مگر وہ ترک مجھے پھر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید تمہاری اس دن کی پھٹکانے اس کے سر سے عشق کا بھوت اتار دیا ہے۔ بھگوان کہے کہ ایسا ہی ہو ورنہ میری زندگی ترک ہو جائے گی کوئی

پہا خانہ میں مجھے پورے دن پر تیار نہ ہو گا۔ لوگ مجھے ایک درسیا کی طرح
 سمجھے لگیں گے اور جیسے جی مجھے جو اتنی کی چتا پر خود کو بھینٹ چڑھا تا پڑے گا۔
 بھینٹ چڑھیں تمہارے دشمن تم بالکل چننا نہ کرنا سب ٹھیک
 ہو جائے گا۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتا رہا۔ "لا جوتی" کے نئے
 واقعے کی بھولی بسری کہانی بن کر رہ گیا۔ لیبہ کیسی کبھا جب اسے اپنے گھر
 کی یاد آتی تو بڑے میاں کا مقدس چہرہ "لا جوتی" کی یادوں کے دتے پر
 دستک دے جاتا اور وہ تھوڑی دیر کے لئے ایک بیٹام ہی خلش
 میں مبتلا ہو کر رہ جاتی۔

آج کئی دنوں کے بعد وہ "لا جوتی" سے ملنے آئی۔ وہ
 ایک بھتہ بھتہ بیان کا سالہ سید شروع ہو رہا ہے۔ ایک بھتہ بھتہ سہرا
 کی ہر گلی کوچہ دوہن کی طرح سجا دی جائے گی۔ خاص کر ٹرامنڈر
 دیکھنے سے تعلق رکھتا ہو گا۔ جب سند کے نئے بیماری شری گوپال جی نے
 ہیں اس مندر پر بڑی بہتار آگئی۔ مگر اس سالہ سید اس سے پہلے
 شاید تمہیں نہ دیکھا ہو۔

گھنٹوں میں سہرا ہی تھی۔ لیکن ان دنوں مجھے کھلا آرہا تھا۔
 اس بے سید کی گھاگھی میں نہ دیکھ سکی۔ ہاں تھے بیماری کے بارے
 میں بھی بہت دن سے سن رہی ہوں۔ کئی بار تو من میں آیا کہ تم کو لے کر
 چلوں کم سے کم وہ سن ہی کر لوں مگر سوچ ہی سوچ کر رہ گئی۔ میں نے
 تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ کنواری کنیاؤں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے
 اور نہ ہی انہیں اپنا پرن چھونے دیتے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں تک سچ

اور کہاں تک جھوٹ ہے دن رات دھیان گیان میں لگے رہتے ہیں۔ ہر دم بھگوان کی سیوا بھگوان کی یاد بھگوان کا ذکر پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھگوان کے سوا اب دنیا میں کچھ ہے ہی نہیں شہر والے تو بہت ہی خوش ہیں جس کو دیکھتے پجاری کا گیت گاربا ہے۔ ہر شخص ان کا نام احترام سے لیتا ہے بعض لوگ تو ایسا بھی کہتے ہیں کہ شری گوپال ہی بھگوان کے نئے اوتار ہیں ایسے بجا پرشس کے ورشن کے لیے اپنا من تو بہت زیادہ بیا گل ہے مستعد ہے کہ اس میلے میں وہ کنواری کنیاؤں کو اپنا چرن چھونے دیں گے۔ لایو! تم تیار رہنا۔ اس سال کا یہ یاد گار میلہ میں تمہیں ضرور دکھلاؤں گی۔

میں تو ابھی سے تیار بیٹھی ہوں۔ بس خوشی کی زیادتی میں تم مجھے بھول نہ جانا۔ مجھے بھیڑ بھاڑ پسند نہیں۔ میں متدر اور پجاری ہی کا ورشن ہے شانتی سے کنپا ہستی ہوں بھاگ بھاگ میں کچھ مزہ نہیں آئے گا۔

آج متھرا کی سچ و سچ پورے شباب پر بے بڑے غیر آزما انتظار کے بعد وہ دن آتی گیا۔ تو متھرا والوں کے لیے خوشیوں مسرتوں اور شادمانیوں کا سیلاب بھرتا ہے۔ ہر طرف سے آدمیوں کا سیلاب ہے کہ بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ ہر شخص خوش ہے کیا مرد کیا عورت کیا بچے کیا بوڑھے، خاص کر کنواری کنیاؤں کا اضطراب شوق تو بس دیکھنے کی چیز ہے۔ متھرا کا سارا مشن آج شری گوپال ہی ہمارا حق کے مندر میں سمٹ کر چلا آیا ہے۔ پانی پہ چکولے کھانی ہونی کشتی کی طرح ترام ناز سے تسیم سحر کی طرح عورتوں کا خوبصورت ہونا سیر و لوں کو بے دردی کے ساتھ پامال کرتا ہوا مندر میں داخل ہونے لگا۔ خورش ایک طرف سے مندر میں داخل ہوئیں۔ بھگوان کی صورتی پر بار بچوں ڈالنے اس کے بعد بڑے پجاری کے چروں کو چھو کر ان کا آشر وادیتیں اور دوسرے

راستے سے ہٹ جاتیں۔ یہ سلسلہ صبح ہی سے چل رہا تھا۔ دن کے تیسرے گھنٹے
 جب عورتوں کی بھیت ٹرختم ہوئی تو سب کے اخیر میں لاجوتی اپنی پیاری سہیلی
 روپ وتی کو لیکر مدر میں داخل ہوئی۔ سب کے پہلے اس نے بھگوان کی مورتی
 پر پھول چڑھایا پھر پوجا پاٹ کیا۔ اس کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ
 نئے پجاری شری گوپال جی کی طرف بڑھی۔ پہلے روپ وتی نے پڑیوں کو چنوک
 آشر فاد لیا۔ وہ پجاری کی شخصیت سے بہت مرعوب دکھائی دے رہی تھی۔
 لاجوتی جوں ہی پجاری کے قدموں کی طرف بڑھی ایک جھٹکے کے ساتھ
 پجاری نے پاؤں سمیٹ لئے۔ اور اس کا ماتھ ہٹاتے ہوئے کہا: نہیں نہیں!
 تم بیمار پاؤں چومنے کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہو۔ بلکہ میرے دل کے
 سنگھار میں پر حکومت کرنے کے لئے۔ یہ سکر لاجوتی بگا بگا رہ گئی اور
 عالم حیرت میں اس کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ بڑے خور سے پجاری
 کی طرف دیکھنے لگی۔ پجاری نے سکر اتے ہوئے رشتت لہجے میں کہا چھانے
 کی کوشش نہ کر رہی ہو اٹھا سکتے ہی اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ یادوں کے
 درپے کھلتے گئے جسم کی تمام حیات اس کی آنکھوں میں آگئیں تصور میں طے
 پر قشتے کی جگہ سب کے کا نشان اور دارمی سے بنیاز پرے پر ٹھوس
 و پر عا ز دارمی سے بھرا ہوا وہ پہرہ ننگے آنے لگا جو بہت دنوں پہلے سزا
 یہ کو تیاڑھتا ہوا نظر آیا تھا

خوشار سوانی وحی ہے

سزا ہے وہ ہے یکا بگا ہے

اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا آ آپ! اس کا دہن دھوا
 دھواں ہو رہا تھا۔ سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی کہ مسلمانوں کا مذہب

پیشوا اتنے بڑے مندر کا پجاری کیونکر ہو سکا؟ اس سے زیادہ وہ کچھ سوچ نہ سکی
 اس کا ذہن تاریک ہوتا چلا گیا اور وہیں غش کھا کر گر پڑی۔ روپوتی اور پجاری
 دونوں نے اُسے پک کر سنبھالا۔ مندر پر پانی کے پھینٹے مارے۔ کھوڑی دیر
 بعد اُسے ہوش آیا ابھی اسکی حیات کا طلم ٹوٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ پجاری نے
 کہنا شروع کیا۔ بات زیادہ دنوں کی ہو گئی۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو۔ ایک دن
 اسی مندر میں سر راہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ تم نے مجھے بہت ذلیل کیا
 تھا۔ میری عمر اور دماغی کا طمعہ دیتے ہوئے تم نے مجھے بڑی طرح رسوا کیا تھا
 اس پر مجھے اس زندگی میں پہلی بار انتہائی خیرت اور ندامت محسوس
 ہوئی تھی۔ میں نے صرف تمہارے لئے دنیا بھر کی ذلتوں اور رسوائیوں کو اپنا
 مقدر بتایا تھا۔ اپنے مذہب کا سب سے بڑا اعزاز ٹھکرا کر صرف تمہاری ایک جھلک
 کے لیے دریدگی ٹھوکریں کھاٹا رہا۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے دل پر بڑے
 سے بڑا زخم برداشت کر لیا لیکن تمہارے ہاتھوں اس دن کی بے عزتی پر تڑپ
 اٹھا میں تمہیں پانے کے لئے اپنی خوشحال اور مطمئن زندگی سے اتنی دُور آچکا
 تھا کہ لب واپسی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اپنے عالمانہ وقار کو قربان کیا۔
 لوگوں کی نگاہوں میں دھرم سے بے دھرم ہوا۔ تم نے اپنی بدنامی کے ڈر سے
 اپنے وطن کو چھوڑ کر کشن مراری کے شہر متھرا میں پناہ لیا۔ اور مجھے میری جان
 بے تاب بنے بے گھر و بے در کر کے چھوڑا۔ اتنی دُور سے میں صرف تمہاری خاطر
 اپنی جان کو بھینٹی چڑھ کر متھرا میں داخل ہوا۔ مجھ پر رحم کھاتے کے بجائے بڑی
 بے آبروی کے ساتھ تم نے مجھے دھتکار دیا۔ میرے درد دل کو نہیں سمجھا۔ مذہب
 و سماج نے تمہیں مجبور یوں کی پتہ دیواری میں قید کر دیا مگر میرے عشق
 جنوں نیز کی سرحدوں کا زور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ تم میں کسی جوگن کا جذبہ

انگریزیاں نہ لے سکا جبکہ قیس و فریاد نے میرے جذبے کو نئی راہ پر لاپسکا۔ یہ میرے جذبے کی سچائی ہی تو ہے کہ میں آج بند و دھرم کے سب سے بڑے منصب پر براجمان ہوں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک مسلمان عالم متحضر کے مندر کا بڑا پروہت بھی بن سکتا ہے۔

تو کیا آپ نے میرے لیے اپنا مذہب بھی بدل دیا ؟

نظاہر تو میں نہ صرف ہندو بلکہ ہندوؤں کا سب سے بڑا پیشوا ہوں مگر خدا گواہ آج بھی میری رات کی تہستانی میرے بچوں سے آباد ہے رات کے ستارے میں جب اپنے ماضی کی طرف پلٹتا ہوں تو آہوں آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ سویرا کر دیتا ہوں مگر سورج کی ہر کرن تمہیں حاصل کرنے کا جنون اتنی گزرتا ہے نئی ہمت عطا کرتی ہے یہ میرے جذبے کی تڑپ ہی تو ہے جو تمہیں یہاں تک پہنچ لائی۔

لیکن آپ مولوی سے پجاری کیسے بن گئے ؟ روپ وقتی نے مجھے

ہوئے سوال کیا ؟

دونوں غلوں میں تو صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ میرے جذبے کی تڑپ نے

مجھے مولوی سے پجاری بنا دیا۔

اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایک عورت کے بچے پیار میں آپ

مولوی سے پجاری بن گئے۔ مگر بننے کیسے ؟ یہ جاننا چاہتی ہوں ؟

اب سے تقریباً دو برس پہلے جب لاہور نئی نے مجھے سربراہ ذلیل

درسا کر کے میری عمر اور دائرہ عمل کا مذاق اڑایا تھا۔ اس حادثے نے مجھے ہلا

ڈالا اور قریب تھا کہ میں اپنے مقصد میں ناکام ہو کر ملک کے کسی دور دراز

گوشے میں جا چھپتا۔ مگر پھر اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے جذبے نے مجھے

ایک نئی طاقت اور نیا حوصلہ عطا کیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک خطرناک
 ترین فیصلہ کر ڈالا۔ بالآخر میں نے زندگی ہی داؤں پر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔
 سب سے پہلے میں نے دارُھمی منڈائی۔ ماتھے پر سجدے کی نشان کی جگہ
 قشقہ لگایا اور گلے میں زنار ڈال کر اسی مندر میں بڑے پجاری مہاراج کے
 پاس آ گیا۔ پجاری جی نے مجھ پر رحم کھاتے ہوئے مندر میں بٹھرنے کی اجازت
 دے دی۔ مندر کی صاف صفائی اور پجاری جی کی خدمت میں نے بڑی لگن
 کے ساتھ انجام دینی شروع کی اور ساتھ ہی دھیرے دھیرے پجاری جی سے
 ہندو دھرم کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ عربی فارسی اردو کا عالم تو میں پہلے
 ہی سے تھا۔ وہی فطرت ذہانت میرے کام آئی اور بہت جلد میں نے ہندی
 پر عبور حاصل کر لیا۔ اور ساتھ ہی پجاری جی کی خدمت میں نے بڑی اپنائیت
 و خلوص کے ساتھ کرنی شروع کی۔ پجاری جی میری خدمات سے متاثر ہونے
 لگے۔ اب وہ مجھ پر خصوصی توجہ دینے لگے یہاں تک کہ دھیرے دھیرے میں
 ان کا مقصد خاص ہو گیا۔ ادھر قدم قدم پر قسمت میرا ساتھ دینے لگی۔ لاہوتی کو
 حاصل کرنے کا مقصد ہمیشہ میرے سامنے رات دن جاگتے ہوئے کوئی لمحہ
 ایسا نہیں گذرا جو اس سنگدل کی یاد سے خالی ہو۔ میں اپنی محبوبہ کو حاصل
 کرنے کے لیے جو خطرناک ترین قدم اٹھا چکا تھا اس کا مجھے بری طرح سے
 احساس تھا۔ ذرا بھی شن گن لگ جاتی تو میری ہڈیوں کا پتہ تک نہ چلتا۔
 سب زیادہ اذیت ناک میرے لیے یہ احساس تھا کہ ایک عورت کے لیے
 میں نے زندگی کو داؤں پر لگایا جی تھا ایمان کو بھی عشق نامراد کی اس کھٹی
 یں ڈال دیا۔ اگرچہ میرا دل مطمئن تھا۔ اسانی عنایت پر میرا ایمان
 اس تھا کہ کفر کی ظاہری شکل و صورت اختیار کر لینے کے بعد مجھ میں نہ ہی

کیا گیا مگر وہ جس نے مجھے غسل و خرد سے بچانہ کر دیا تھا مجھ سے میری زندگی کی ساری خوشیاں چھین جانے کے بعد بھی میں اس کے دل میں اپنے لئے کوئی نرم گوشہ نہ پیدا کر سکا تنہائی اور حسرت و بے بسی کے عالم میں پھوٹ پھوٹ کے روتا۔ جب دل کی بھر اس نخل بجاتی تو جلوہ یار کے تصور میں گم ہوتا اور جھوم جھوم کے پڑھتا ہے

بیاد دلربا خوشحال می باش گے افضل گے گو پال می باش
 اوہ میں جذبات کی رومیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پجاری جی میری خدمت، ذہانت، دنیا سے بے تعلقی اور گیان دھیان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مرتے وقت مجھے اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ چنانچہ آج مجھے تم اس منصب پر دیکھ رہی ہو یہ میری خدمات کا صلہ اور پجاری جی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔

پجاری بن جانے کے بعد میرے لئے لاہوتی کو حاصل کرنا کچھ دشوار نہیں تھا لیکن میں اپنی بے لوث قربانیوں سے اس کے دل کو جیتنا چاہتا تھا تاکہ میرے عشق کو ہوس کا نام نہ دیا جاسکے میں نے دو برس کا یہ طویل عرصہ کانٹوں اور انگاروں کی سیج پر گزارا ہے۔

مہاراج ! اب بس کیجئے اب زیادہ سُننے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے یہ کہتی ہوئی لاہوتی پجاری کے قدموں پر گر پڑی اور روتے ہوئے کہنے لگی کہ مجھے کیا معلوم آپ میرے لیے اتنی بڑی قربانی دیں گے، اتنی بڑی نپسیا کریں گے مجھے معاف کر دیں۔ میں زندگی بھر آپ کی داسی بن کر رہوں گی اگر آپ ہندو ہیں تو میں ہندو ہوں اور اگر آپ مسلمان ہیں تو میں مسلمان ہوں۔ روپا میری جان ! تم بھی معاف کر دینا۔ میں نادان تھی۔ مجھے نہیں

معلوم تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے اتنی بڑی قربانی دے سکتا ہے۔ میں نے اس سچی محبت کی قدر نہ کی اسے جو بس سمجھ کر ٹھکراتی رہی آج میری آنکھوں سے پرے اٹھ گئے ہیں۔ اُسٹھے مندر کی اس چہار دیواری سے کسی ایسی طرف چل نکلیں جہاں ہم مکمل آزاد ہوں۔“
 ایک صبح حسب معمول مندر کی گھنٹی بجنے میں تاخیر ہوئی۔ ٹھے پجاری کے نائب نے انتظار کے بعد مندر کے معمولات کو پورا کیا اپنے کام سے فارغ ہو کر جب دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھٹکا چلا گیا کمرہ خالی نظر آیا۔ پجاری کو بہت تلاش کیا مگر پجاری پھر کبھی نظر نہ آیا۔
 یہ کہانی ہے ”مولانا محمد افضل جتھانوی“ کی جو کمالات ظاہری سے آراستہ اردو ہندی، عربی فارسی کے زبردست عالم اور نامور شاعر گندے ہیں۔ علی قلی خاں یاغستانی نے اپنی مشہور کتاب ”ریاض الشعراء“ میں مولانا کو ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے جگہ دی ہے۔ تذکرہ میر حسن میں بھی آپ کا ذکر ملتا ہے۔ بڑی عمر میں ایک بندوڑ کی پر ایسے عاشق ہوئے کہ اس کی خاطر انھیں بڑے بڑے انقلابات سے گزرنا پڑا۔ انجام کار وہ مولانا کی قربانیوں سے متاثر ہوئی اسلام قبول کیا اور آپ کے نکاح میں آگئی مولانا نے اپنے عشق کی سر مستیوں کو بارہ ماسہ عرف بگٹٹ کہانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بارہ ماسہ دراصل ہندی طرز کی ایک منظوم داستان ہے جو بھراں نصیبی اور درد و فراق کی پرالم داستان پر مشتمل ہے۔ افضل کے بارہ ماسہ کی زبان بہت قدیم ہے۔ اور شمالی ہند کے اردو نظموں کی اولین شکلوں کی ایک شکل ہے۔ اس کے باوجود اس کی زبان کافی سلیس ہے اس نظم میں فارسی کی بندشیں بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ تو

آدھا تیر آدھا بٹیر کی جلوہ نمائی ہے سے

پہ سازم چوں گنم کس کن پکاروں جتن کیا عشق کے غم کا پجاروں

جنوں در ملک جانا بھنڈا گر ایا سمجھ اور بوجھ کا تھانہ اٹھایا

چو شد مدت پیاسے سنگ لپتے مرم بایک دگر کہتے و سنے

چہ می بینم کہ منگل گاوتی ہیں مے گھر تاریاں سب آوتی ہیں

فارسیت کے اپنے غلبے کے باوجود بارہ ماہ جذبات کے اعتبار سے

خالص ہندی کا ایک شاہکار ہے جس میں ہندووانہ طرز معاشرت کی بھر پور

نمائندگی کی گئی ہے۔

مولانا افضل کا انتقال ۱۳۸۵ھ میں ہوا

یہ عشق نہیں آساں تو جس کو سمجھتا ہے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جاتا ہے

بھین پیکوں کا بوجھ

”دو دوزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ“

لیکن تصویر کائنات کا یہ رنگ اسکی جگا ہوں میں دھندلا پر چکا تھا۔
 نصف بہتر سپردگی کا تمام تر انداز لے دعوت عمل بتی ہوتی تھی۔ حیات اپنی تمام
 رعنائیوں، رنگینوں، دلفریبیوں کے ساتھ اس کے گرد رقص کناں تھی۔ مگر اس
 کے ساتھ وہ اعتناء نہ کر سکا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بڑا متقی تھا بلکہ اس لیے کہ
 شباب کی تمام تر مسرتیں اور جذبہ دروں کی جنوں خیزی اس کے لیے صرف
 لمحاتی ثابت ہوئیں۔

کھلی جو آنکھ تو پھر زادا حاصل نہ رہا

ایک بچے کا باپ ہونے کے بعد وہ دوسرا بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت
 سے محروم ہو چکا تھا۔ قوت مردی کا وہ خزانہ جس سے تصویر کائنات خوش رنگ
 نظر آتی ہے، خالی ہو چکا تھا۔ جس وقت اس پر اس خوفناک حقیقت کا
 انکشاف ہوا۔ وہ سو جان سے کانپ اٹھا پچیس سال کی عمر کوئی بڑھاپے
 کی عمر تو نہیں ہوتی۔ اپنی عمر سے کم بیوی جو اب تک صرف ایک بچے کی ماں
 بن سکی تھی۔ آنے والی پہاڑی طویل زندگی کے رُوح فرسا تصورات نے
 اسکے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ بیوی پر اس کمزوری کے اظہار سے پہلے اندر اندر
 سنے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

بہار اب آکے کیا کرنے گی کہ جن سے تھا جن رنگ و نغمہ
 وہ گل سُر شاخ بل گئے ہیں وہ دل تہہ دام بچھ گئے ہیں
 شرم و ندامت میں ڈوب کر بالآخر ایک دن بڑی ہمت سے کام لیکر
 مری ہوئی آواز میں اٹکتے جھمکتے۔ اسے اس تلخ حقیقت کا اظہار اپنی بیوی
 پر کرنا پڑا۔ سُننے ہی وہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ گریہ بے اختیار سے اسکی پلکیں
 نم آلود ہو گئیں چونکہ وہ رفیق حیات تھی۔ صرف شریک عیش و نشاط نہیں۔
 مشرقی لڑکیاں خصوصاً دیہات کی پتی ورتا میں بہت آگے ہوتی ہیں۔ ان کی
 ضمیر میں وفاداری کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ نمائش و البانہ پن، طرح
 داری، عشوہ طرازی کے بجائے سادہ لوحی کے ساتھ وفاداری ان کا خاص
 وصف ہوتا ہے۔ ابتلاء و آزمائش کے وقت ان کی وفاداریوں کی ہمت
 بہت کم بدلتی ہے سے

ترک تعلقات کو اک لو چاہئے، لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا
 آنکھیں دکھانے، سرد مہری کا مظاہر کرنے اور علی گئی سنانے کے بجائے
 اس نے اپنے شوہر سے علی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ تسلی دیتے ہوئے بکھایا
 آپ گھبراہٹیں نہیں یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ آپ دوا کرائیں۔ خدا نے ہر
 بیماری کا علاج پیدا کیا ہے تو کیا اس کا علاج پیدا نہیں کیا ہوگا؟ آپ
 پوری کوشش کریں چاہے جتنا روپیہ خرچ ہو۔ پیسہ کیا ہے۔ ہاتھ کا میل
 وہ پھر آجائے گا اور میرے لئے بالکل فکرنہ کریں۔ میں کل بھی آپ کی تھی
 آج بھی آپ کی ہوں۔ اور کل بھی صرف اور صرف آپ کی رہوں گی۔ یہ نقصان
 تنہا آپ کا نہیں۔ میں اس میں برابر کی شریک ہوں۔ دکھ کا یہ بوجھ اٹھانے
 میں آپ تنہا نہیں، یہ درد مشترک ہے میں آپ کی بیوی ہوں، جو رو ہوں،

دکھ سکے آرام تکلیف کی ساتھی۔

بیوی کی ان تسلی آمیز باتوں سے اسے بڑا سکون ملا۔ پھر تو علاج معالجے میں اپنی سکت بھر کوشش میں لگ گیا۔ مگر سے

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اپنی توفیق کے مطابق ایک سے ایک سیانے، حکیم، ڈاکٹر سب کو دکھا کر تھک گیا مگر کسی طرف سے روشنی کی کوئی کرن نہیں دکھائی دی۔ شفاء نام کی چیز ہمیشہ اس سے دس قدم دور رہی۔ اب تو اس کا بچہ بھی بڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر کھیلتا بھاگتا۔ بیوی نے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ اس کا ساتھ دیا مگر کہیں سے چارہ گری نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے تھک ہار کر مایوسیوں کے اتھاہ ساگر میں اس کا دل ڈوب کر رہ گیا۔

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
لے فصل بہاراں نصرت ہو ہم لطف بہاراں بھول گئے
دنیا کے حکیموں، ویدوں، ڈاکٹروں اور سیانوں سے جب وہ مایوس
ہو گیا تو اسے خدا مستوں کی یاد آئی۔ بالآخر ایک دانہ آدمی کے مشورے پر وہ
ایک اندولے، کی بارگاہ تک پہنچ ہی گیا۔ اللہ کے اس مقبول بندے
کی صورت دیکھ کر اس کی بے قراری کو قرار آیا۔ اس کی مقدس پیشانی سے
سعادت کی صبحیں طلوع ہو رہی تھی اور پرنور سراپا سے ولایت کی بزرگی،
پادشاہی، جہانگیری اور اقبال مندی کا آفتاب ہویدا تھا۔
اے صبح سعادت ز جبین تو ہویدا

جمال وزیبائی، سطوت و جبروت اور جاہ و جلال کا ایسا سپریم
کہ دل خود ہی اسکی طرف کھینچتا جائے سے

کشمہ دامن دل می کشد جا ایں جا است
اور اگر چند صحبتیں نصیب ہو جائیں تو ذل نیاز پیشہ کا اخلاص رنگ
لائے تو پھر سے

ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے
ایسا پر وقار سراپا، ایسی صاحب اثر و نفوذ شخصیت، ایسا صاحب فضل
و کمال، سنت نبوی اور شریعت مطہرہ کا اس قدر التزام شوق رکھنے والا۔ اس
سے اچھا اچھے اچھوں نے کم ہی دیکھا ہوگا ع
تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

اور وہ بیچارہ تو تھا ہی ایک عام سا آدمی۔ کئی دن تک ذور ہی ذور
سے دیکھتا رہا۔ کچھ عرض کرنے کی ہمت نہ کر سکا وفا آشنا بیوی ساتھ ہی ساتھ
تھی۔ حالات کی کڑی دھوپ نے اسے وقت سے پہلے سنجیدہ، بردبار اور متین
بنادیا تھا۔ اس کے کھودنے، اکسانے، حوصلہ دلانے پر چھکتے اُتکتے اُسے ہمت
بھی ہوئی تو وہ اس مرد درویش نگہ التفات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا
کئی دن بیت گئے مگر وہ مرد خدا مست اسے ٹالتا رہا۔ لوگوں کو اس سے زیادہ
اس کی بیوی پر ترس آتا جو اس کے پیچھے بن کی کوئل بن چکی تھی۔

مزاج شناسوں نے دونوں میاں بیوی کو اپنی طرح ذہن نشین
کرادیا تھا کہ تم لوگ مایوس یا بد دل نہ ہونا۔ دیر لگ سکتی ہے لیکن اپنے
مقصد میں تم ضرور کامیاب ہوؤ گے۔ لاکھ ٹالے جاؤ، بہلائے جاؤ، ڈلٹے
پھسکارے جاؤ۔ لٹس سے مس مت ہونا، تمہارے جیسے جاننے کتنے پریشان حال
لوگ آئے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ بہلائے جاتے ہیں، پھر ٹالے
جاتے ہیں، پھر ڈالٹے اور پھسکائے جاتے ہیں، پھر بھگائے جاتے ہیں، ذلتوں

ان آزار کو جو لوگ جمیل جاتے ہیں وہ اپنی منزل پلٹتے ہیں اور جنہیں اپنی اناؤ
کے مجروح ہونے کا احساس شدید تر ہوتا ہے۔ حرمٰں نصیبی ان کا مقدر بن جاتی
ہے۔ پھر تو ع

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
بالآخر ایک دن رنتموں کا سویرا ہوا۔ مشیت ایزدی کو اس پریشان حال
دیہاتی پر رحم آگیا۔ قبولیت و اجابت کی ساعت سعید کی وہ مبارک منزل ہی
پہنچی کہ جہاں پر سے

نگاہ مردنومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کا اجالا پھیلتا ہے۔

مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا وہ قدسی صفات بندہ اپنے
معمولات سے فارغ ہو کر بستر نماز پر تشریف فرما ہو چکا تھا۔ سفید بے داغ بستر
پر سر پائے پینٹا نے دو دو سفید تکیے! شمع کو پروانوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا
تھا۔ آہنگی اور شستگی کے ساتھ میٹھے مدھر لہجے میں سلسلہ کلام جاری
تھا۔ لہہائے ناز پر دلاؤ زیر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے میں اسی کرموں جلے
کی آواز ابھری! اے حضور! ہمیں اچھا کر دیجئے!

”کون ہو بھائی؟“

”میں ہوں عبدالعزیز مسرکار“

”کہاں رہتے ہو؟“

”راج نیپال میں سوئی برگدوا ایک گاؤں ہے وہیں کارہنے والا ہوں۔“

حضور! میں بہت پریشان حال ہوں۔ اپنی سکت بھر دوا دارو کر کے تھک چکا ہوں
حکیموں، ڈاکٹروں کی کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ بڑی آس لے کر آپ کے پاس

آیا ہوں۔ مجھ پر رحم کریں میرے لئے دعا کریں۔

» ارے بھائی جبر العزیز! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اس لائق ہوں
اگر میں اس لائق ہوتا تو خود ہی اچھا نہ ہو جاتا؛ اُسے دن حکیم قیصر کے یہاں ناپا
جاتا رہتا ہوں دو اکرانے کے لئے۔ جاؤ مولانا لوگوں سے دعا کرو وہ نائب
رسول ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں زیادہ قبول کرتا ہے۔ میرا پاس
کیا ہے؟ میں کس لائق ہوں؟ «

بڑی خوبصورتی کے ساتھ آپ نے اسے ٹالا۔ مگر وہ بدصوبھی اتنا دن
رہتے ہوئے نیم ہوشیار ہو چکا تھا اور بھائی لوگوں نے سکھا پڑھا کر کسی حد
تک پکا کر دیا تھا۔ خوشگوار موڈ اور زیر لب تبسم نے اُسے وصلہ بخشا۔
ٹمے سادگی اور بھولے پن سے کہنے لگا: اچھا حضور! تو روپیہ لیکر اچھا کر دیجئے
اس کی سادہ لوتی نے اہل محل کو زعفران زار کر دیا۔ آپ بھی ایک
جھکے سے ساٹھ کر بیٹھ گئے مسکراتے ہوئے فرمایا: ہاں دوست! یہ بات تم
نے کام کی کی ہے۔ آخر میرے بھی بال بچے ہیں۔ دس بیس آدمی آئے دن
بھان ہوتے ہیں۔ اتنے لوگ آتے جاتے ہیں مگر تم ہی ایک کام کے آدمی
بھلے۔ اور سب کو تو صرف اپنی غرض سے غرض ہوتی ہے۔ میری ضرورتوں
کے لیے نہیں سوچتے۔ اپنی کوئی تجارت نہیں، کوئی کھیتی باڑی نہیں۔ کوئی
ملازمت نہیں آخر اتنا لمبا خرچ۔ چلو اگر کسی نے نہیں تو تم نے تو سوچا۔ شاہا
میرے دوست! اچھا بتاؤ تو سہی کتنا روپیہ دے رہے ہو اچھا کرانی؟
» دو سو روپے لے لیجئے حضور! اور ہمیں اچھا کر دیجئے «

» بھلا دو سو روپے سے کیا ہوگا؟ اتنے سے کون سا کام بنے گا؟ اگر یہی
بات ہے تو تم مجھ سے چار سو روپے لے کر مجھے اچھا کر دو۔ کم از کم حکیم قیصر کے

یہاں جانے آنے سے تو فرصت مل جائے (اپنے خادم خاص چودھری دوست محمد سے فرمایا، چودھری صاحب عبدالعزیز بھائی کو چار سو روپے دے دو۔ یہ ہمیں اچھا کریں)۔

» اچھا سرکار! چار سو روپے لے لیجئے مگر ہمیں ضرور اچھا کر دیجئے «
 » چودھری صاحب! بھائی عبدالعزیز کو آٹھ سو روپے دے دو۔ یہ ہمیں اچھا کر دو «
 اب تو غریب بہت حیران و پریشان ہوا کہ اب کیا ہوگا؟ یہاں تو ڈبل بولی بولی جاتی ہے۔ مگر وہ ہمت نہیں ہارا۔ اہل محل اس مکالمے سے کچھ ہنس رہے تھے کچھ مسکرا رہے تھے اور کچھ اس کی سادہ لوحی اور بے وقوفی پر ترس کھا رہے تھے۔ ایک بار پھر وہ ہمت کر کے روتی ہوئی آواز میں کہنے لگا، » حضور! دوا کرانے میں بڑا روپیہ خرچ ہو گیا۔ میری ساری تڑی تاڑی ختم ہو چکی ہے۔ اب پانی پانی میرے پاس صرف چھ سو روپے بچے ہیں۔ یہی لے لیجئے اور ہمیں اچھا کر دیجئے « اتنا کہہ کر رو پڑا۔ آنکھیں پھلک پڑیں۔ اسکی اس کیفیت اور کہنے کے انداز نے محل پر سناٹا طاری کر دیا۔ آپ بھی خاموش ہو گئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس مزد خدامت پر ڈھیروں برف ڈال دیا ہو۔ کیونکہ ایسے لوگ بڑے سے بڑا غم برداشت کر سکتے ہیں، بڑی سے بڑی کلفتیں اور اذیتیں خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل جاتے ہیں مگر کسی غریب کی » بھگی پلکوں کا بوجھ « ان سے نہیں اٹھتا ہے۔

اشک میرے ہیں مگر دیدہ نم ہے اس کا

یہی ان نفوس قدسیہ کے گھر کی ریش رہی ہے۔ یہی ان کا وطیرہ رہا

اور یہی روایت! تھوڑی دیر تک بڑا بوجھل سناٹا طاری تھا کہ اللہ کے

اس برگزیدہ بندے کی آواز ابھری «عبدالعزیز! جی سرکار! ادھر دیکھو وہ کنویں پر جو نالی بنی ہے اس پر بیٹھ کر نمازی لوگ وضو کرتے ہیں۔ کل صبح تم اس نالی کے اندر جو بھی کچر اکائی ہو اسے صاف کیا کرو۔ تم کو ثواب بھی ملے گا کہ ایک طرح سے نمازیوں کی خدمت ہوتی ہے۔ اور ادھر دیکھو اس کونے میں ایک گونی ٹنکی ہوئی ہے احاطہ پاک میں یا باہر راستے میں عربی و فارسی اردو میں لکھا ہوا کوئی کاغذ پڑا دیکھو تو اسے اٹھا کر اس بوری میں ڈال دیا کرو۔ بس جاؤ»

اس کی دوسری صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ ڈیوٹی پر لگ چکا ہے۔ جب دیکھو نالی صاف کرتا نظر آتا یا احاطہ پاک میں لکھا ہوا زمین پر پڑا کاغذ چنتا ہوا ملتا۔

ٹھیک پندرہ دن بعد وہ پھر حاضر ہوا۔ بارگاہ کرم میں حاضری کا تو انداز وہی تھا مگر چہرے کی صحت و توانائی کی سُرخی اور سکون و مسرت کا پھیلا ہوا اجالا بتا رہا تھا کہ اس کی عمر میوں کے طویل شب کی صبح ہو گئی۔ زندگی سے بھرپور آواز میں عرض کرنے لگا۔

«حضور! اب ہمیں چھٹی دے دیں»

«کیوں بھئی عبدالعزیز! کیا تم اچھے ہو گئے؟»

«ہاں سرکار ہم اچھے ہو گئے»۔ ایک دم سے اچھا ہو گیا سرکار جیسے پہلے تھا

ع میرے ہونٹوں پہ بستم یہ کرم کس کا ہے

«بھائی مبارک ہو۔ اللہ نے تمہیں اپنے فضل سے صتمند کر دیا۔ اچھا تو

پھر کب آؤ گے؟

«جب جب حضور کا حکم ہو»

” اچھا جاؤ لیکن سال میں ایک بار ضرور آتے رہنا۔“
 ” نہیں سرکار! ہم تو سال میں کئی بار حاضری دیں گے۔“
 ” کئی بار تو تم آ ہی نہیں سکتے۔ کسان آدمی ہو فرصت ہی کم ملے گی۔ مگر
 سالانہ بھنڈا رے (جلسے) میں تم ضرور آنا اور اس خاصری کو اپنا معمول بنالینا۔“
 وہ غریب خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ آپ کو دُعا میں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔
 سہ نہ پوچھ ان خرد پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
 ید بیضی لے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

یوں تو خوش بھیاں، فیروز مندیاں، ارجمندیاں خود ہی اس کی
 بارگاہِ ناز میں چشمِ دابرو کی منتظر رہا کرتیں، اس کی برکتوں کے فیضان
 نے تیرہ بختیوں کو بخت رسا اور محروموں کو خوش نصیب بنا دیا۔ پستیاں
 اس کے قدموں سے پٹ کر نقطہ مروج کا اعزاز حاصل کرتیں۔ کتنے کنگلے فقیر
 پرواہے اس کی ایک نگہ کیما اثر سے مسندِ اعزاز کے صدر نشین بن گئے۔ مگر
 وہ آج خود اپنے نصیب کی ارجمندی پر نازاں ہے۔ جسکی ایک نگہ البقات کے لیے
 امیر رئیس، منصب دار، رجاؤں سے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ آج وہ خود
 عالم سرخوشی میں سراپا نیا زینا ہوا ہے کہ اس کے صحنِ حرم وہ تشریف لایا
 (خواب ہی میں سہی) جو اقلیمِ ولایت اور کائناتِ عشق کا تاجدار تھا، عالمِ اسلام
 کا، ہستیِ معتبر تھا، بحرِ تدقیق و تحقیق کا شناسا اور تھا۔ علوم و فنون کا شہسوا
 تھا۔ فضل و کمال کا شہر یار تھا، ملتِ بیضا، کا محافظ، اسلام کا حامی
 و ناصر اور ناموس رسالت کا پرہیزگار تھا۔ جس نے محبتِ رسول کے کشت
 ویراں کو لالہ زار کیا۔ دل کی ریگزار وادیوں میں عقیدت کے چشمے جاری کئے
 دشتِ وحشت میں محبت کے پھول کھلائے۔ دلِ خانما برباد کو آباد کیا۔ بادِ فنا

کارخ موڑا۔ اور آندھیوں کی زد پر عشق کا چراغ جلا دیا۔ جو اپنے آقا کی چوکت کا گدا مگر اپنی مسند فیض و عطا پر سلطان عشق تھا۔ جس کے عشق جاں سوز کی صدائے دلنواز ایک گوشے سے ابھری، پھر دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کو اپنی پیٹ میں لیتے ہوئے اقصائے عالم پر چھا گئی۔ براعظم ایشیا، یورپ، امریکہ اور آفریقہ بدر دیکھے۔ دیوانوں کی محفل میں وہی "بلبل ہزار داستان" نواسخ نظر آتا ہے ع

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

جسے دنیائے عرب و عجم کے ارباب علم و دانش اور اصحاب فضل و کمال نے بڑے احترام و عقیدت کے ساتھ "عبدِ واعظِ اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی سے یاد فرمایا۔

کہا جاتا ہے کہ عام بندہ مومن کا خواب نبوت کا پھیالیسواں حصہ ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی مقبول بارگاہِ حق خواب دیکھتا ہے تو خواب زیادہ حقیقتوں کا نقشہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ رونما ہونے والے اہم ترین امور غیبیہ کا روشن آئینہ اس کے ہاتھوں میں دے کر قدرت واضح انداز میں اسکی رہنمائی کرتی ہے۔ ع جن کے رتبے ہیں سو ان کے سوا مشکل ہے

اس نے دیکھا کہ اس کی خانقاہ کے وسیع برآمدے میں اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی تشریف لائے ہیں۔ وہ احمد رضا بن کا استغفار بنا گیا۔ رسالت پناہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں بھی ہوتا رہا۔ عبقری الشرق عالم اسلام کی عظیم المرتبت بستی نے اپنے قدم مینت لزوم سے اس کی خانقاہ کو عزت بخشی ہے۔ ابھی وہ تشریف لا کر بیٹھے ہی تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے

آپ کے گرد انسانوں کا کثیر جمع ہو گیا اور لوگوں نے ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا۔ آنکھوں میں احترام و عقیدت کی چمک کے بجائے خصومت و غضب کی ہوس ہے پھر ہر طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا اور بتدریج اس میں جارحیت پیدا ہوتی گئی۔ آپ ہر ایک کو دلائل و براہین کی روشنی میں سکت جواب دیتے ہیں۔ دندان شکن جواب سن کر بجائے خاموش ہو جانے یا مان لینے کے کٹ جتنی پر اتر آتے ہیں۔ اگر ایک طرف سے سوالات کا سلسلہ کچھ نرم پڑتا تو فوراً دوسری طرف جارحانہ یورش شروع ہو جاتی۔ آپ تنہا بدخواہوں، شورش پسندوں کے زغے میں ہر طرف سے سوالات جارحانہ کی مسلسل یلغار لیکر ان حملوں کی دفاع میں پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں اور وہ مرد جاں نثار عالم اضطراب میں کبھی آپ کے دائیں بائیں کبھی آگے پیچھے ہوتا رہا۔ بالآخر تھوڑی دیر کے بعد شکست کی ذلتوں سے دوچار ہو کر وہ سب راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔

بدخواہوں، بد مذہبوں، شوہ پستوں کے بھاگ جانے کے بعد جب قدمے سکون ہوا تو اس آبروئے عشق و وفا نے سکرانے ہوئے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ دشمنوں کے زغے میں تمہارا وجود بڑا غنیمت ثابت ہوا۔ مگر اضطرابی کیفیت میں تمہارا بار بار میرے آگے پیچھے دائیں بائیں ہونے کا کیا مطلب تھا؟

حضور والا! برصغیر ہند میں آپ کی ذات علم و یقین، عشق و عرفان کا سرچشمہ ہے۔ برصغیر میں ناموس رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گرد آپ کی زبان و قلم نے بڑا سخت پہرہ قائم کر رکھا ہے۔ عشق رسالت کے

ساتھ ناموس رسالت کی پرہیزی کا اعزاز بھی حضور والا کو حاصل ہے۔ میں اپنے طور پر محسوس کیا کہ ان ظالموں کی نیت اچھی نہیں اور اس چشمہ فیض کو نقصان پہنچانے کے درپے آزاد ہیں تو بس طرف ہجوم زیادہ ہو جاتا تھا میں اسی طرف ہو جاتا تھا کہ مبادا آپ کی ذات والا صفات کو وہ کوئی نقصان پہنچاتا چاہیں تو میں آپ کی ڈھال بن جاؤں۔ اگر میرے گھر میں حضور کی ذات کو ذرا بھی نقصان پہنچ جاتا تو میں اپنے کو زندگی بھر معاف نہیں کرتا۔ اور کہیں بارگاہ رسالت سے جواب طلبی ہو جاتی کہ اپنے گھر میں تو میرے عاشق و جاں نثار اور میرے ناموس کے پرہیزی کی حفاظت نہ کر سکا؟ تو پھر کیا جواب دیتا؟ اس لیے میں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی حیات کی آخری سانس تک آپ پر آنچ آنے نہیں دوں گا۔ یہی سب سوچ کر کبھی حضور کے آگے کبھی دائیں کبھی بائیں ہو جاتا تھا۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اپنے اس گنہگار بندے کی لاج رکھ لی۔

رات کے پچھلے پہر جب آپ کی آنکھ کھلی تو اپنے ارد گرد عشق و وفا کی خوشبو محسوس کی۔ رات کے خواب کا نقشہ سطح ذہن پر ابھرتا چلا گیا۔ فجر کی نماز کے بعد جب تعبیر کی فکر ہوئی تو مٹ تصور میں ایک جھماکہ ہوا کہ یہ خواب زیادہ مشیت کا واضح اشارہ ہے کہ یہاں ایک دینی قلعہ تعمیر کیا جائے جس میں قرآن و حدیث کی تعلیم اور دین پاک مصلیٰ اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترویج و اشاعت ہو۔ بالخصوص مسلک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا (جو دراصل مذہب اہل سنت اور مسلک امام اعظم ابوحنیفہ ہے) کی نشر و اشاعت کی جائے خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی تاکہ اسلام و سنت کا اجالا چاروں طرف پھیل جائے۔ چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد اپنے وسیع و عریض خالقاً

میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ چودہویں صدی کے نصف آخر کے پہلے عشرے
 میں ڈور ڈور سے علماء و مدرسین بلائے گئے۔ اور پھر خالص اس روحانیت
 کی آماجگاہ میں قال اللہ وقال الرسول کی صدائے دلنوازی بلند ہونے لگی۔ اسکی
 نیت کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ ایسے ماحول میں جبکہ ادارے خواہ وہ دینی ہوں
 یا دنیوی اپنے باپ دادا کے نام سے منسوب ہوتے تھے اس نے خالص رضائے
 الہی و عشق رسالت پناہی کے پیش نظر اپنے بیکراں اخلاص کا زبردست مظاہرہ
 کرتے ہوئے اس «ذات جامع الصفات» کے نام منسوب کیا جس نے گنتی
 کی زلف برہم سنواری، حیات کا چہرہ نکھارا، اور انسانیت کی مردہ رگوں
 میں زندگی کا گرم گرم لہو عطا کیا۔ ظلم و جہل کی تاریکیوں میں علم و یقین کا
 اجالا پھیلایا اور ساری کائنات کو عرفان و آگہی کی دولت سے مالا مال
 کر دیا۔ معلم کائنات، محسن کائنات حضور پر نور روحی فداہ جناب احمد مجتبیٰ
 محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت گرامی سے منسوب کرتے
 ہوئے اس کا نام دارالعلوم فیض الرسول رکھا۔

استاذ الاساتذہ جمع البحرین حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی سابق
 شیخ الحدیث فیض الرسول بڑاؤں شریف نے استبصار فرمایا۔ حضور والا!
 فی زمانہ اکثر دیکھنے میں آیا کہ لوگ اپنے اداروں کے نام اپنے نام پر رکھتے
 ہیں تو اس ادارے کا نام «مدرسہ یار علویہ» رکھنے کے بجائے «فیض الرسول»
 کیوں رکھا؟

آپ نے فرمایا مولانا مدرس و تدریس کا یہ دینی ادارہ در
 سہ کار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فیض ہی فیض ہے اس لیے
 اس کا نام «فیض الرسول» ہی مناسب تھا۔ اپنے نام و نمود کو دخل

دینے سے اخلاص باقی نہیں رہ جاتا ہے

ہو گئی دل کو تیری یاد سے اک نسبت خاص

اب تو شاید ہی میسر بھی تنہائی ہو

جس دور میں آپ نے "فیض الرسول" کی بنیاد رکھی۔ اطراف و جوانب میں دور دور تک جہالت کی تاریکی کا یہ عالم تھا کہ نماز جنازہ پڑھانے کے لئے صحیح تلفظ سے غاری معمولی پڑھے لکھے آدمی کی تلاش میں کئی کئی گاؤں کا چکر لگانا پڑتا۔ اس پر بھی خوش نصیبی سے کوئی بل جاتا تو سبحان اللہ ورنہ بغیر نماز جنازہ پڑھے میت کو دفن کر دیا جاتا۔ اور قبر کے سرھانے ایک لکڑی گاڑ دی جاتی جو اس بات کی علامت ہوتی کہ اس قبر میں جو میت مدفون ہے اسکی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی ہے اگر حسن اتفاق سے کوئی پڑھا لکھا آدمی اس قبر سے گزرے تو صاحب قبر کی نماز جنازہ پڑھ دے۔ یا للجب

اور آج فیض الرسول کے فیضان کی برکت ہے کہ بستی، گونڈہ، علاقہ بھانجھر، نیپال کے بارڈر سے لیکر اندرون نیپال تک علم کا اجالا ہی اجالا ہے گاؤں گاؤں مدرسے، مکاتب اور علماء دین کی بہتات ہے۔ علاقائی و ضلعی سطح سے بہت آگے دور دور تک اندرون ملک فیض الرسول کا چشمہ فیض جاری و ساری ہے۔ اور اب تو بیرون ملک بھی فیض الرسول کے فیض کا چشمہ سیال بہ رہی ہے۔ اللہم زدو زدو۔

ہندوستان میں پودہ یوں صدی ہجری کے نصف آخر کی ابتداء میں طبقہ صوفیاء میں آپ پہلے فرد ہیں جنہوں نے اپنی خانقاہ کو شریعت و طریقت کا بہترین سنگ بنایا۔ خالص روحانیت کے ماحول میں علمائے شریعت کو دین پاک مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ترویج و اشاعت

کے لیے جمع فرما کر ان کا ایسا اعزاز و اکرام فرمایا کہ مدارس میں اسلامیہ کے ارباب
 بست و کشاد کی طویل فہرست میں اس کی مثال نایاب کی حد تک کیا ہے
 اس مرد خداست کے اخلاص بے پایاں کا نتیجہ ہے کہ فیض الرسول آج
 اسلامی علوم کا ایک شہر بن چکا ہے۔ اپنی چند در چند امتیازی خصوصیات کی
 بنیاد پر ہندوستان بھر میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آج پورے ملک
 میں للجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے بعد اپنے مالہ و مایلیہ کے اعتبار سے
 اپنی نوعیت کا وہ ایک منفرد ادارہ ہے۔ عوام تو ڈور رہے خواص کو بھی جانے
 دیجئے انھیں انھیں کا وہ طبقہ جن کی شخصیت آفاقی اور جن کے فکر و نظر
 پر سواد اعظم اہل سنت و جماعت کو اعتماد ہے ان کا اعتراف و رجوع اس
 بات کا غماز ہے کہ اس مرد خدا آگاہ کے اخلاص بے پایاں کی جڑیں بہت
 گہری ہیں۔

سوال المکرّم ۱۳۰۶ھ میں سلسلہ اشرفیہ کے تاجدار، اکابر علماء
 کرام کے مرکز عقیدت حضرت علامہ سید مختار اشرف صاحب قبلہ اشرفی
 جیلانی سجادہ نشین سرکار گلاں کچھوچھہ شریف کا اپنے پوتے کی تسلیم و
 تربیت کے لیے "فیض الرسول" کا خصوصی انتخاب حضرت مولانا سید نعیم اشرف
 والد گرامی حضرت مولانا سید کلیم اشرف جانی کا اپنے ذہین ترین و بلند پایا
 شہزادگان سید علم اشرف و سید تقیم اشرف کی تعلیم و تربیت کے لیے
 فیض الرسول کو پسند فرمایا۔ اہل سنت کے قیمتی سرمایہ، زبان و قلم
 کے بادشاہ، صاحب فکر و نظر، اردو اور مذہبی ادب کی آبرو، حضرت علامہ
 ارشد القادری کا اپنے لڑکے اور فیض العارفین مولانا غلام آسی برادر اکبر
 علامہ ارشد القادری کا اپنے نواسے کی تسلیم و تربیت کے لیے "فیض الرسول"

کا انتخاب!۔ یہ فیض الرسول کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے جو دراصل

اسی مزدرویش کی روحانیت کی جلوہ سامانیاں ہیں سے

یہ فیضان نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے جس نے اسمعیل کو آداب فرزندہ

اسم گرامی :- آپ کا اسم گرامی شاہ محمد یار علی ابن فخر علی ہے

ستائیسویں پشت میں آپ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہ سے ہوتا ہوا

مولائے کائنات شیر خدا مشکل کشا حضرت مولا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے

جاملتا ہے اور اٹھارویں پشت میں آپ کے جد اعلیٰ اور سلطان الشہداء

حضرت سید سالار مسعود غازی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دادا ایک ہو جاتے

ہیں آپ کا سن ولادت ۱۳۱۵ھ اور سال وفات ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۲ مئی

۱۹۶۷ء جمعرات کا دن گذر کر شب میں ایک بجکر پچیس منٹ پر ہے کل عمر

شریف اسی برس۔

وَطْن مَالُوف - یوپی کے مشہور ضلع بستی میں شہر بستی نے

جانب شمال ساٹھ کلومیٹر دور باہنی تحصیل سے جانب مغرب نو میل ایک

مقام براؤن شریف ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ ہندوستان میں قیام

کے لیے پہلی بار بارہ بنکی آئے۔ چنانچہ سلطان الشہداء حضرت سید سالار

مسعود غازی کے والد گرامی سالار صاحب جو سلطان محمود غزنوی کے ایک تلوار

جریں تھے (جن کے عقد میں محمود غزنوی کی بہن اور سلطان ناصر الدین سلجوقی

کی بیٹی بی بی ستر معلیٰ تھیں جو سید سالار مسعود غازی کی والدہ تھیں) ان کا

مزار پاک بارہ بنکی کے مشہور قصبہ سترکھ میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

پھر وہاں سے منتقل ہو کر میر پور بہرائچ آباد ہوئے۔ انقلاب ۱۹۷۷ء

سے پونے دو صدی پیشتر آپ کے دادا خورشید علی نے تیر پوہرا پٹنہ کو چھوڑ کر براؤں شریف کی مستقل سکونت اختیار کی۔

بایں ہمہ نسبی کرامت آپ نے حسب و نسب کو کبھی اپنے لیے باعث افتخار نہیں جانا بلکہ ان اکو مکم عند اللہ التکرم اور ولا فضل للعربی علی العجمی ولا للجمعی علی العربی کلکم من بنی آدم و آدم من التراب کے مطابق آپ نے حسب و نسب کے بت کو اپنے پاس کبھی پھٹکنے ہی نہیں دیا کہ اسلام میں بزرگی کا معیار کبھی بھی خالص حسب و نسب رہا بلکہ بزرگی کے لئے سب سے بڑا معیار خشیت الہی و تقویٰ خداوندی مانا گیا ہے

حسن زبیرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابو جہل این چہ بو العجمی است

اس لیے اگر کوئی آپ سے حسب و نسب کے متعلق پوچھتا تو آپ فرماتے ہیں ایک گنہ گار سنی مسلمان ہوں، اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا بریلوی سے والہانہ لگاؤ اور شدید جذباتی وابستگی تھی کہ دونوں کا قدر مشترک "عشق رسول" تھا۔ اگرچہ زمانہ پاتے ہوئے ظاہری ملاقات نہ ہو سکی۔ ماتھے کی آنکھوں سے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کو نہیں دیکھا تھا۔ عشاقانہ بارگاہ رسالت کے قافلہ سالار حضرت خواجہ اویس قرنی نے بھی زمانہ پاتے ہوئے حدیہ کہ مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے باوجود سیدالسادات فخر موجودات آقائے کائنات سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ماتھے کی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر کیا کسی دیکھنے والے سے ان کا جذبہ سوزدروں کم تھا؟ یہ تپ سینہ سوزاں ہی کا تو فیضان تھا کہ انھیں بارگاہ رسالت سے خلعتِ زیبا عطا ہوئی اور ہمیشہ کے لیے عشق

کی سروری کا اعزاز عطا ہوا۔

ان کے سچے نائب اور برصغیر ہند میں کاروانِ عشق کے سپہ سالارِ اعظم
سیدنا امام احمد رضا کو شیعب الاولیاء شاہ مہدیار علی نے ماتھے کی آنکھوں
سے نہیں دیکھا تو کیا ہوا؟ اپنے خانہ دل میں آپ کی عقیدت و محبت کا جو
پراج آپ نے جسہ رکھا تھا۔ علم دین کی اشاعت اور عشق رسول کی
تبلیغ للحب فی اللہ والبغض فی اللہ کا عملی مظاہرہ جو اعلیٰ حضرت
کاشن خاص تھا۔ صوفیاء و عرفاء کے طبقے میں اس کی طرح کس نے آگے
بڑھ کر اس غیر معمولی بوجھ کو اپنے توانا اور مضبوط کاندھے پر اٹھایا؟ اور
گر گھر علم دین و محبت رسول کا اجالا پھیلا یا۔

مَرْجَا لَی عَشْقِ خَوْمَشِ نَوْدَا لَی مَآ

اے دوائے جملہ جہتہائے مآ

شیریشہ سنت حضرت علامہ حشمت علی خان لکنوی سے قلبی نگاہ و دراصل
یہ سرکار اعلیٰ حضرت سے بکراں عقیدت کا شاخشاہ تھا۔ بستی، گوڈہ، فیض آباد
نانپارہ وغیرہ اپنے بریدوں میں شیر حق کو لے کر دورہ کیا، جگہ جگہ جلسے منعقد
کرائے۔ جلسوں، مناظروں، مقدموں میں شیر حق کا بھرپور تعاون اور
حق رفاقت ادا کیا۔

ولادت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موقع پر براؤن شریف
میں بڑے عظیم پیمانے پر جشن منانے، خومش عقیدہ مسلمانوں کا تاریخی
اجتماع ہوتا۔ جلیل القدر ملائے کرام کی تقریریں ہوتیں۔ کتب و فوٹوں
سے سرکار اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی سپیکروں روپے کی کتابیں لیکر
مفت تقسیم فرماتے۔

ہندوستان کے اپنے تاریخی سفر میں اپنے مرکز عقیدت سلطان عشق
سیدنا امام احمد رضا کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ فاتح خوانی کے وقت آپ
کے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں بند چہرہ آنسوؤں میں
ڈوبا ہوا ہے

لب و ابین آنکھیں بند ہیں پھلی ہیں جھولیاں
کتے مزے کی بھیک تیرے پاک دد کی ہے

حضور والائے اپنی زبان فیض ترجمان سے خود ہی بیان فرمایا۔ "اعلیٰ حضرت امام
اہلسنت کے مزار پاک پر عاضری و فاتح خوانی کے وقت مجھ پر ایک گہری
کیفیت طاری تھی جس کا نقشہ میں الفاظ میں نہیں کھینچ سکتا۔ عارف
باللہ، فاشق رسول، عالم باعمل، مجدد دین و ملت کو گویا میں اپنی آنکھوں سے
دیکھ رہا تھا ہے

نہ ذوری دلیل صوری بود

کہ بسیار دوری ضروری بود

خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی کا تراجم عقیدت

ملاحظہ ہو۔

» شیخ المشائخ شعیب الاولیاء عارف حق حضرت علامہ صوفی مشاہ
عسد یار علی علیہ الرحمۃ والرضوان اس صدی کے ان بزرگوں میں سے
ہیں جن کی ولایت و بزرگی کو اکثر علمائے کرام و مشائخ عظام اور بے شمار
عوام و خواص نے تسلیم کیا۔ مجھے بھی اس کا شرف حاصل ہے کہ میں نے انکا
زمانہ ہی نہیں پایا۔ بلکہ متعدد بار ان کی زیارت سے مشرف ہوا۔

نانچارہ (بہرائچ) کے ایک تاریخی اجلاس میں (جو حضرت علیہ الرحمۃ

کے زیرِ صدارت تھا۔ ہمیں مناظرِ شیرِ بیشہ اہلسنت منظرِ اعلیٰ حضرت مولانا حسنت علی
خان صاحب لکھنوی علیہ الرحمۃ والرضوان بھی شریک تھے۔ رئیسِ نانپارہ حاجی
ضیاء اللہ صاحب کا دولت کدہ ہم سب کی قیام گاہ تھا۔ اس سفر میں حضرت
علیہ الرحمۃ کو میں نے بہت قریب دیکھا اور ان کے اخلاص و محاسن اور خرد
نوازی سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ ایک متعلّبِ سنی صحیح العقیدہ مردِ درویش
ہی نہ تھے بلکہ سیدنا امام احمد رضا بریلوی سے وابہانہ عشق بھی رکھتے تھے۔
یہی وہ قدرِ مشترک تھا جس نے حضرت شیرِ بیشہ اہل سنت اور حضرت
شیخ المشائخ کو قریب تر کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ زندگی کی آخری سانس تک
مسکب اعلیٰ حضرت کے نمائندہ و ترجمان تھے۔

تنزل و انحطاط کے اس ہوشربا دور میں جبکہ دھیرے دھیرے
خانقاہوں سے علم اٹھتا جا رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے
دارالعلوم فیض الرسول کی بنیاد ڈال کر اپنی خانقاہ کو علمِ ظاہر و
باطن کا سنگم بنا دیا اور علمائے حق کا کارواں اتار کر علم کا ایسا چراغ
روشن کیا ہے جو ہمیشہ کے لئے ان کی علمی یادگار بن گیا۔

(سوانح حیات شیخ المشائخ - از مولانا نسیم بسوی)

عبادت و ریاضت، عبادت و ریاضت، زہد و اتقا، قیامت و استغفار
خاصانِ خدا کے یہ زیور ہوتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی سہرت میں ان سب
کا تذکرہ بطورِ خاص ملتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی عبادت و ریاضت، توکل و استغفار، قدم
قدم پر شریعتِ مطہرہ کا احترام و التزام بالخصوص نماز باجماعت تکبیر اولیٰ کی
پابندی یہ آپ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ متعدد بار حج و زیارت کے

وقت بھی آپ اپنے اس معمول پر کار بند رہے۔ یہاں تک کہ جب اپنے سلسلے کے مشائخین کی زیارت کی نیت سے ہندوستان کا تاریخی سفر فرمایا۔ تو اس میں بھی نماز باجماعت تکبیر اولے کا اہتمام بطور خاص پیش نظر رہا۔ آپ کے اس وصف خاص کی بڑی شہرت ہے کہ آپ چالیس برس سے زائد نماز باجماعت تکبیر اولیٰ پر سختی کے ساتھ کار بند رہے۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کی آخری نماز مرض الموت کے عالم میں پڑھی وہ بھی نماز باجماعت تکبیر اولے کے ساتھ۔ فالحمد لله تعالیٰ علیٰ ذلک۔

نماز فجر کے بعد جب مصافحہ فرماتے تو مصلیان مسجد جو خاص کر اساتذہ و طلبہ ہی ہوتے ان کو بڑی پابندی کے ساتھ یہ تلقین فرماتے۔
 ”میاں نماز تو نماز۔ جماعت تو جماعت۔ بات تو جب ہے کہ تکبیر اولیٰ

نہ چھوٹے یہی نماز اللہ سے ملا دیتی ہے۔ آپ کی دوستی و دشمنی الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کی روشنی میں ہوتی۔ اپنے ملنے والوں و اہل عقیدت و ارادت کو ہمیشہ یہ نصیحت فرماتے ”میاں کسی سے دوستی کرو تو اللہ کے لئے اور کسی سے دشمنی کرو تو اللہ کے لئے اس سے الگ رہ کر کچھ نہیں۔ ہر نماز پنجگانہ کے لئے آپ اس قدر اہتمام فرماتے کہ دوسرے لوگ عید بقر عید کی نماز کے وہ اہتمام نہ کر پاتے۔

آپ کی مسجد، مسجدیں تو دنیا میں ایک سے ایک نہیں، بنتی ہیں اور بنتی رہیں گی۔ اپنی شوکت و عظمت فن تعمیر کے اعتبار سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ آپ نے بھی اپنی وسیع خانقاہ میں ایک مسجد بنائی، جو فن تعمیر اور سہیت صوری کے اعتبار سے اسے غیر معمولی نہیں۔ البتہ جس عباد اور دیہات کے ماحول کے اعتبار سے اسے قابل ذکر کہا جاسکتا ہے۔

مگر اس کے لئے آپ نے جس خلوص بے پایاں، اہتمام بکراں اور احترام
فراواں کا مظاہرہ فرمایا۔ اسلامی تاریخ میں اس کی مثال کے لیے ذور ڈونگ
تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تمام ترین و آرائش کے ساتھ
پہلی اینٹ سے لیکر آخری اینٹ تک نماز باجماعت تکبیر اولیٰ پر بنی ہے یہاں
تک کہ اگر کسی دن مغرب کی اذان ہوگئی اور کام کرنے والے کاریگر میناے
کی بلند یوں پر میں تو آپ تکبیر تحریمہ کے لیے اس وقت تک اللہ اکبر
نہیں کہتے جب تک کاریگر پیچھے کھڑے ہو کر کہ نہیں دیتے کہ ہم حاضر ہو
ہیں۔ اور کاریگر بھی کیسے؟ فارسی وقار نہیں؛ بلکہ متشرع اور پارخ وقت
کے نمازی۔ اور اگر اتفاقاً کسی دن کسی کاریگر کی ایک رکعت بھی نماز
باجماعت چھوٹ جاتی تو اس دن اس کاریگر کو کام سے روک دیتے
مگر دن بھر کی پوری اجرت عطا فرماتے ﴿فَمَا آتَا اللَّهُ تَعَالَىٰ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ﴾
یہ رتبہ بلند عا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

الذرت العزت کے گھر کی تعمیر میں حضرت شاہ صاحب نے جو
زبردست احترام فرمایا اس کی جزا انھیں دینے والا رب جانے یا لینے
والا جانے۔ مگر دنیا نے تو یہ دیکھا کہ ان کے عظیم الشان خوبصورت اور
پر شکوہ روضے کی تعمیر ان کے مرید مخلص الحاج سیٹھ محمد یوسف و
برادران رئیس نانپارہ (بہرائچ) نے اپنے جیب خاص سے کرایا تو اس
بات کا خاص اہتمام فرمایا کہ ان کے روضے کی تعمیر بھی نماز باجماعت
تکبیر اولیٰ پر ہو۔ روضے کی تعمیر میں ایک طویل عرصہ لگا لیکن کسی دن

اگر کسی کاریگر کی اتفاقاً جماعت کی ایک رکعت بھی چھوٹ جاتی تو الحاج سینہ
 محمد یوسف صاحب اس دن کاریگر کو کام کرنے سے روک دیتے مگر دن بھر
 کی پوری اجرت دیتے۔ اور یہ کہہ کر خوش ہوتے کہ جس نے خدا کے گھر کو
 اس قدر اہتمام و احترام کے ساتھ بنایا اس کے گھر کو بھی تقریباً اسی
 اہتمام کے ساتھ بنایا جائے گا۔

علوم دینیہ کی نشر و اشاعت سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ مدارس
 اسلامیہ کی ضرورت و اہمیت پر کافی زور دیتے ہوئے فرمایا۔

تعلیمی ادارے قائم کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ اول اس لیے کہ
 شریعت کے بغیر طریقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اس لیے کہ
 انبیاء و مرسلین صرف نماز روزے اور اوراد و وظائف ہی کے لیے دنیا
 میں تشریف نہیں لائے بلکہ عبادات و اعمال کے ساتھ دینی تعلیمات کی
 اشاعت کے لیے بھی بھیجے گئے۔ نماز، روزے، اوراد و وظائف سے آدمی
 خود تو سنبھل سکتا ہے لیکن دوسروں کو سنبھالنے کے لیے علم کی
 ضرورت ہے۔

اسی ضرورت کے تحت آپ نے اپنی خانقاہ میں دارالعلوم
 فیض الرسول کی بنیاد رکھی اور اپنی حیات ہی میں اسے پروان چڑھانے
 کی کامیاب جدوجہد کی۔

اسے اسلام و مسنیت کی اشاعت و عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم
 کی تبلیغ کا ایک اہم مرکز بنایا۔ ان کے پسماندگان میں شہزادگان، اساتذہ
 اور ارباب بست و کشاد نے اپنے خون جگر سے اسے نقطہ عروج کا اعزاز بخشا۔
 اور آج تو اس کے اجالوں سے ایک جہاں روشن ہے۔ پس

خداے بزرگ و برتر ان کے تربت اور پردن رات لگاتار سخت و نور کی
بارش برمائے سے

اے ازمنہ براؤں تیری عظمت کے تصدق
سینہ ترا آرام گہ یسارِ حکے ہے
ہر ایک بلا دور ہوئی نام سے ان کے
ہر ایک و بان کے تصور سے ٹلی ہے

دیوتا کی شکتی

شدھی تحریک کو کچلنے کے لیے جماعت اہلسنت کے علماء و مشائخ دیوانہ وار آگے بڑھے اور بڑی پامردی و استقلال کے ساتھ طوفانِ بلا خیز کا رخ موڑ کر اُمتِ مسلمہ کو ایک تباہی سے بچا لیا۔

دسمبر کی سرد ترین رات کا پچھلا پہرہ ہر سوسناٹا اور کہر کی دھند میں لپٹی ہوئی پھسکی چاندنی اپڈت دیا نند کو صبح بھور میں اُٹھنے کی دیرینہ عادت تھی۔ کیا گرمی کیا جاڑا، اپنی عادت کے مطابق وہ صبح سویرے اٹھ کر رفع حاجت کے لئے نکل جاتا۔ روزانہ کی طرح وہ آج بھی ہاتھ میں لوٹا لئے ہوئے گاؤں سے باہر نکل کر وہ پیل کے اس تناور درخت کے نیچے سے گذر جانا چاہتا تھا جس کے نیچے سے وہ ہمیشہ گذر کرتا تھا۔ وہ بچپن سے سنتا آیا تھا پیل کے مقدس درخت پر بھگوان براجمان ہوا کرتے ہیں۔ اس وہم کو وہ زندگی بھر اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ دن رات جب کبھی اس پیل کے درخت پر نظر پڑتی تو بڑی عقیدت کے ساتھ نظریں بچا کر ایک لمحہ کے لئے سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیتا۔

روکھی پھسکی پچاندنی اور کپڑوں کے دھند میں لپٹے ہوئے پیپل کے درخت
 کی نیچے پنڈت دیانند کو ایک غیر معمولی بیوی نظر آیا۔ جسم کے سائے روکنے
 کھڑے ہو گئے۔ ڈرتے جھکتے۔ بشکل تمام چند قدم آگے بڑھا۔ بیوی کی
 صورت تھوڑی سی واضح ہوئی۔ پنڈت کی گھٹکی بندھ گئی۔ غیر ارادی
 پیچ پر وہ قابو نہ پاسکا۔ خوف و دہشت سے اس کے جسم کے سائے
 ساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

یوں تو بھاٹے کی لمبی رات میں صبح تڑکے ہی نیند پوری ہو جایا
 کرتی ہے مگر کاہلی اور سستی سے لوگ لیٹوں میں گھسے رہتے ہیں۔
 پنڈت کی اضطرابی پیچ نے قریبی گھروں کے لوگوں کو بستر چھوڑنے
 پر مجبور کیا۔

کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کی آوازوں کے ساتھ ہر طرف سے لوگوں نے
 پنڈت کو گھیر لیا۔ کئی آدمیوں کے ساتھ ایک بار پھر پنڈت بہت کدے
 درخت کی طرف بڑھا۔ دھیرے دھیرے صبح کا اجالا پھیل رہا تھا
 پھسکی پچاندنی دم توڑ رہی تھی۔ پیپل کے نیچے اتنا اجالا پھیل چکا تھا
 کہ چند قدم کے فاصلے سے لوگ واضح طور پر کچھ دیکھ سکیں۔

پنڈت اور اس کے ساتھیوں نے پیپل کے نیچے جو کچھ دیکھا
 وہ ان کے حواس باختہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر پنڈت نے بہت
 جلد اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ تھیر تھیر مسرت کے عالم میں وہ گرتا پڑتا
 گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔ دُور مسرت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی
 بھگوان آگے۔ بھگوان آگے۔ دیوتا جی نے اپنے پیارے پیارے چرنوں
 سے ہمارے بھوی کو پوتر کر دیا۔ صبح ہی صبح جس نے بھی پنڈت کی

اچھے پوچھا۔ دیوتا جی کہاں ہیں؟ کس کے یہاں؟
 پیپل کے نیچے! پیپل کے نیچے! جلدی جاؤ۔ فوراً پہنچو! کی
 صد لگاتا، بانپتا، کانپتا، پھولتا پھکتا۔ کالی چرن کے گھر پہنچا۔
 کالی چرن!..... او کالی چرن، ارے کالی چرن کے نیچے جلدی
 نکل!

کالی چرن آنکھیں ملتا ہوا حیرانی کے عالم میں باہر نکلا۔ اسے پنڈت
 جی بہاراج! اتنے سویرے سویرے اور وہ بھی ہم جیسے آدمی کے گھر پر!
 خیریت تو!

ارے دیوانے سب "کشل منگل" ہے میں تجھے آج سچا دھارک
 بنانے آیا ہوں۔ تو سب زیادہ میرا مذاق اڑایا کرتا تھا۔
 کیسا مذاق! پنڈت جی!

بھول گئے میری ہر بات کو چکیوں میں اڑا دیتے ہو۔ خاص کر جب
 کبھی پیپل کے درخت کو سسٹیس نو اکر پر نام کرتے دیکھ لیتے ہو تو اس دن
 جینا دو بھر کر دیتے ہو۔ وہ تو میں پھر بھی کروں گا۔ بھلا پنڈت جی بہاراج!
 یہ کوئی بات ہوئی جو تم کہتے ہو کہ پیپل کے درخت پر بھگوان بیٹھا کرتے
 ہیں تو کیا بھگوان کو پدھارنے کے لئے پیپل ہی کا درخت ملا تھا۔
 بھگوان کو پدھارنا ہی ہو گا تو آم، امرود، جامن، سیتا پھل وغیرہ کے
 پٹیر پٹیشیں گے جس پر پھل فروٹ میوہ مسٹھان ہوتا ہے نہ کہ پیپل کے اوپر
 جو نہ زندے میں نہ مردے میں۔

کالی چرن کی چھتی ہوئی باتوں سے پنڈت کو طرارہ آگیا اور پیار
 بھرے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ارے نادان بالک! کیوں اپنے ایمان

ستیاناں کرتا ہے۔ چل آج تیری آنکھوں کی پٹی کھل جائے گی۔ بھگوان نے میری بنتی سن لی ہے۔ میری پستیا کی لاج رکھ لی ہے۔ تمہیں جیسے نادان بالکوں کے ایمان بچانے اور تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے بھگوان نے اپنے سنگھاسن کو چھوڑ کر تم جیسے پاپیوں اور روشیوں کو پوتر اور زدوش بنانے کے لئے پیپل کے نیچے آنے کی کراپا کی ہے چلو اپنی بیل جیسی آنکھوں سے دیوتا کی شکتی کو دیکھ کر اپنا ایمان ٹھیک کر لو۔ پنڈت یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے مڑا۔

کالی چرن بھی خیرانی کے عالم میں پنڈت کے پیچھے چلنے لگا۔ گاؤں سے باہر نکل کر پیپل کے نیچے دیوتا کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔

قد آور اور تو انا جسم، ڈاڑھی اور مونچھوں سے بھرا ہوا بے حد دکش چہرہ، ماتھے پر قشقہ، گلے میں چندن کی مالا۔ ایک پاؤں پر کھڑے، دونوں ہاتھ جوڑے سر جھکائے، آنکھیں بند کئے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز! شخصیت کی دلاویزی اور پروقار سراپا نے ہر ایک کو سحر زد کر دیا۔ آن کی آن میں یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہر چہار جانب سے انسانوں کے قافلے جھنڈ درجھنڈ آنا شروع ہو گئے۔ بدایوں کے مضافات میں ایک پھل پھل مچی ہوئی تھی۔ دیوتا کی بھیٹ کے لئے ہر کوئی کچھ نہ کچھ لئے چلا آ رہا تھا۔ دودھ، مکھن، گھی، ملائی، لاوی، مٹھائی، پوڑی، سہاری غرض بوڑھے جوان، امیر و غریب، سب حسب توفیق اپنی عقیدتوں کی سوغات لئے دیوتا کے حضور میں حاضر

ہو گئے۔ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے تمام، مگر دیوتا کی ہیئت کذاتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی ایک پاؤں پر ہاتھ جوڑے، سر جھکائے، آنکھیں بند اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز! پھر رات آئی اور صبح بھی ہوئی اور دوپہر کا وقت بھی ہو گیا۔ مگر دیوتا اپنی ہیئت پر قائم رہا۔ لوگ اٹھ بیٹھ، کھاپی کر بے حال ہوتے جاتے تھے۔ مگر دیوتا پر ٹھنڈی گرمی، بھوک و پیاس اور تھکاوٹ کا کوئی اثر نہ تھا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ لالہ گوپتی ناتھ سے رہا نہ گیا۔ اس پاس کے آدمیوں سے پوچھنے لگا۔ بھائیو! دیوتا جی گوشت پوست کے بنے ہیں یا پتھر کے۔ نہ کھانا نہ پینا، نہ سردی نہ گرمی نہ تھکاوٹ ایک پاؤں پر آخر کب تک کھڑے رہیں گے؟

چپ رہے لالہ جی! آپ انھیں دیوتا بھی مانتے ہیں اور ایسے مشہد بھی منہ سے نکالتے ہیں۔ ارے دیوتا بھی اگر ہمارے اور آپ کی طرح دھان پان سے ہوں تو ہم میں اور دیوتا میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ اپنی اتم شکتی کی وجہ سے یہ مہمان ہوتے ہیں۔ ابھی تو صرف ایک رات اور ایک دن ہی ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کب تک وہ یونہی اپنی دیا سے ہم دوشیوں اور مہا پاہیوں کے من کی کھوٹ کو اپنے مشہد ذرشن سے دھو کر ہماری بسا اکل آتماؤں کا اپکار کریں گے؟ یہ ان کی کرپا ہے کہ انھوں نے ہم تن کے اجلے من کے کالوں کو اپنا درشن دیا اور راج سنگھاسن کو چھوڑ کر ہم غریب داسیوں کے یہاں پدھارے۔ رام چندر نے لالہ جی کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ پھر لالہ جی سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ اچھا لالہ جی! ایک بات بتائیے کہ آپ نے اس سے پہلے بھی اتنا پیارا، اتنا سدا راتنامن موہن مکھڑا دیکھا تھا، قسم بھگوان کی چندر ما بھی تو دیکھ کر شرماتا ہو گا۔

دیوتا کو ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے دوسرا دن بھی ختم ہو گیا۔ انسانوں کا ہجوم ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پجاریوں اور پنڈتوں نے دیوتا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ بھجن اور ناقوس کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور پھر پوری رات بھی اس ہیئت کزائی پر ختم ہو گئی۔ کھانے پینے اور مختصر آرام کرنے کے بجائے پنڈتوں کی حالت ابتر ہو رہی تھی، چڑھاؤں اور نذرانوں کی لالچ اور دیوتا کے تقدس ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں، وہ گرگڑا رہے تھے۔ ہمارا دل! آنکھیں کھول دیں۔ اپنے داس داسیوں اور سیوکوں پر ایک نظر ڈال کر ان کے ہر دے کو شانت کر دیں۔

تیسرے دن کا سورج جب دوپہر کی مسافت طے کرنے کے قریب پہنچا تو دیوتا نے آنکھیں کھولی۔ سُرخ اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں سُرخ سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ پجاری کپکپا اٹھے۔ ان کے سارے وجود میں وہ آنکھیں دھنستی محسوس ہوئی۔ مجال نہیں کہ دیوتا سے آنکھیں ملا لیتے۔ بس آنکھ پچی کے ہوئے گرم دودھ کا پیالہ دیا۔ پے پے کئی پیالے پینے کے بعد دیوتا نے آسودہ سسی ڈکار لی۔ اور آہستگی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔

بھگوان نے آنکھیں کھول دیں۔ دیوتا جی زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ خبر سارے مجمع میں پھیل گئی۔ انسانوں کے اس سیلاب میں نئے سرے سے پھر پھل پھل گئی۔ جی بھر کر دیوتا کو دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑے تھے۔ پنڈت اور پجاری بھیڑ کو دیوتا سے دور رکھنے کے لیے سارا زور ختم کے لئے رہے تھے۔ مگر ان جنم جنم کے پیاسوں کے آگے ان کی ایک

پہلی۔ آدمیوں کے ریلے میں پٹنڈتوں کی حیثیت چند تنکوں سے زیادہ نہ تھی۔ پیچ و پکار اور شور و شارسے ایک قیامت پئی ہوئی تھی۔

دیوتا کو ان پٹنڈتوں کی حالت زار پر رحم آہی گیا۔ واضح طور پر دیکھ لیا کہ عوام کے بیٹانی شوق پر کنٹرول کرنا پجاریوں کی سکت سے باہر ہے۔ بڑے ہی پروقار، پاٹ دار اور گکھیرتا کے ساتھ لوگوں کو مخاطب کیا۔

میرے بچو! شانتی اور دھیرج!

میں تمھارے بیچ اتنی سے ضرور پدھاروں گا جس سے تمھارے منوں کی بیا کل کامنائیں شانت ہو جائیں۔

زندگی میں پہلی بار جن جن شوکھے کانوں تک دیوتا کی مشہد بھری آواز پہونچی۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ سمھوں نے فرط عقیدت سے دیوتا کے احترام میں مہر بہ لب ہو کر اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں اور چند قدم خود ہی سے دور ہٹ کر چاروں طرف سے دیوتا کو گھیر لیا اور والہانہ انداز میں ایک تک دیوتا کو دیکھنے لگے۔ اتنے بھاری بھر کم وجود کو اگر آنکھوں کے راستے دل میں اتار لینا ممکن ہوتا تو کب کا دیوتا کو اپنے دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں سمو کر اپنی خیمت زدہ تمنائوں کو شاد کام کر چکے ہوتے۔ ہر ایک اپنے من کی آنگن میں دیوتا کو ننگے پاؤں چلانے کا آرزو مند تھا گو یا زبان حال سے کہہ رہا تھا

دل کے آنگن میں خرام ناز سے آجائے

پروانوں کے ہجوم میں دیوتا ہی آسن جمائے بیٹھے تھے کہ اچانک

اسی درمیان گاؤں کی مسجد سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائے زمزمہ نواز بلند ہوئی۔ سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز! دیوتا کے

گر پہلے ہی خوشی طاری تھی۔ اس صدائے پر سوز نے ایک استقامت
 مسلط کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اللہ اکبر کی اس صدائے فضا کے صدا
 کی لرزش چھین لیا ہو۔ خود دیوتا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں اور
 ایک محویت کا عالم طاری تھا۔ جب صدائے سامعہ نواز ختم ہوئی تو
 دیوتا نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

» ای کاو ہوت ہے ؟ « (یہ کیا ہو رہا ہے ؟)

پجاریوں نے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ » ہمارا ج !
 ای مسلمان لوگوں کے اجان ہوت ہے « (مسلمانوں کی اذان
 ہو رہی ہے)

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی اور دیوتا جی گیان دھیان
 میں بیٹھ گئے کہ پھر وہی ساز جیات کو تھرا دینے والی آواز ابھری۔
 دیوتا جی نے گہرا کر پوچھا » اب کاو ہوت ہے ؟ (اب کیا
 ہو رہا ہے ؟)

ہمارا ج ! آج مسلمان لوگوں کے جمہ کا دن ہے۔ جمعہ کے
 دن یہ دوبارہ اجان دیوت ہیں۔ جب لوگوں جٹ جاوت ہیں تو پھر
 اجان دیوت ہیں اور ان کا مولوی کتاب پڑھت ہے تو اب کی یہ
 اجان کتاب پڑھے کے لئے بھی ہے۔ کتاب پڑھے کے بعد نماز
 پڑھت ہیں۔

نماز کاو ؟

ایشور کی پرار تھنا ! بھگوان کی پوجا !
 یہ سنتے ہی دیوتا، ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا کہ پلو مسلمانو

کی پرارتھنا بھی دیکھ لیوں۔ آگے آگے دیوتا نہاراج اور پیچھے پیچھے انسانوں کا سیلاب مسجد کی طرف دیوتا کو والہانہ انداز میں بجاتا دیکھ کر انسانوں میں نئے بھرے سے ایک بار پھر بچل پچل مچی اور ان کی آن میں وسیع و عریض مسجد کے سامنے آدمیوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔

مسجد کے سامنے ہندوؤں کے اس عظیم اجتماع پر وہ بھی عین نماز کے وقت "مسلمانوں میں خوف و تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ امام مسجد نے صورت حال کی نزاکت دیکھ کر ایک مختصر اور پر جوش تقریر کے ذریعہ مسلمانوں کی گھبراہٹ دور کر کے ان کے خون میں حرارت کی تازہ لہر دوڑادی۔ پھر نماز شروع ہوئی۔ بخیر و خوبی ختم بھی ہوئی۔ اس درمیان مسلمانوں کی عبادت کے طور و طریقوں نے دیوتا کو بہت متاثر کیا۔ بڑے خاموشی اور محویت کے عالم میں دیوتا جی مسلمانوں کو نماز پڑھتا دیکھتے رہے۔ نماز کے دوران ان کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سی چمک پیدا ہوتی رہی۔ نماز کے بعد مسلمان یکے بعد دیگرے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسجد سے باہر نکلنا شروع ہوئے کہ اسی وقت درآن طور پر دیوتا مسجد کے صحن میں گھستا چلا گیا۔ دیوتا جی کو مسجد میں بے تابانہ گھسنے دیکھ کر ہندو مسلمان سب حیران رہ گئے۔ ابھی ان کی حیرت کا ظلم ٹوٹنے بھی نہ پایا تھا کہ دیوتانے امام صاحب سے کہنا شروع کیا: "ہہ ہہ ہہ! بھگوان کی یہ پرارتھنا جو آپ لوگوں کرت رہیں ہم کا بہت بھان! بھگوان کے پوجے کا یہ ڈھنگ بہت الوکھا ہے۔ شریہ کا ہر ہر انگ ایشور کے آگے اس جھکت اور ماتھا ٹیکت بہت بھلا جان پڑت ہے۔ ایشور کے پوجے کا یہ اپائے ہم کاں بھی بتائے دیا جائے۔ ہر دے میں سمانے گوا!"

دیوتا کی باتیں سن کر امام صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جذبات سے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ سوامی جی ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کا کھلے دل سے سواگت کرتے ہیں اور اس بات سے ہمارے جسم کا رُواں رُواں جھوم اٹھا کہ بالآخر پتے دین کی کشش نے آپ جیسے رشی مہنی کو بھی خدا جانے تک کھینچ لایا۔ دیر میں جانے کی بجائے حرم کی طرف اپنے رخ کیا۔ لیکن اس انوکھی عبادت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پاک صاف ہو کر سچے دل سے صرف ایک خدا اور اس کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (جن کا ذکر ویدوں، پرالوں، سنسکرت کے اشلوکوں اور اپدیشوں اور ہندو دھرم کے بہا پرشوں، بڑے بڑے رشی مہنیوں کے ان کہنیوں میں موجود ہے۔ تورات، انجیل، زبورہ و دیگر آسمانی صحیفوں میں جنکی آمد کی بشارت اور ان کی واضح نشانیاں بتادی گئی ہیں) پر ایمان سے لاکر زبان سے کلمہ طیبہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ پڑھ کر پورے عملی و اعتقادی نظام کو قبول کرے تاکہ وہ اسلامی برادری میں داخل ہو کر خُدا کی بندگی بجائے۔

تو آپ جلدی سے پاک و عاف کر کے مجھے اسلام میں داخل کریں نا !!!

خدا کو اسی طرح سے پوجنے کے لئے میں بہت بیاکل ہوں۔ دیوتا اور امام صاحب کی اس گفتگو سے لوگ ذمہ نگو تھے خصوصاً پنڈت حضرات ایک نئی افواہ کا سامنا کر رہے تھے۔ اب تک وہ کچھ نہ کچھ طوفان اٹھا چکے ہوتے۔ ہر ذور میں فرقہ پرستوں اور مذہبی جنونیوں کی کوئی کوم نہیں رہی مگر دیوتا کی اتم شکتی کو وہ اپنے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ

چلے تھے۔ دیوتا کی سحر طراز شخصیت اور اس کے وقار کا جبروت، نیز عوام
 کے جذبہ شوق کی نمود نے انھیں اور حواسِ باختمہ کر رکھا تھا۔ بالآخر
 دیوتا کے شدید اور یوہیم اصرار پر امام صاحب نے حسبِ معمول کلمہ طیبہ لایا
 اَلَا اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ كِي دَوْلَتِ لَانِزْوَالِ سے دیوتا جی کو سرفراز
 فرمایا۔ دیوتا کے مسلمان ہوتے ہی اسلام لانے والوں کا تانا باندھ گیا۔
 شام ہوتے ہوتے سیکڑوں افراد دیوتا کے اتباع میں کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام
 میں داخل ہو گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔
 جس نے جہاں بھی یہ حیران کن خبر سنی تصدیق کے لئے بھاگا چلا آیا۔ پھر دیوتا
 کے اسلام لانے کی برکت یہ ہوئی کہ ہزار ہا ہزار لوگوں کو حق و صداقت اور
 یقین کے اجالوں میں اسلام کا کلمہ طیبہ نصیب ہوا فالحمد لله على نعماته الكا
 شہی تحریک کے ذریعہ عروج میں حضرت مولانا قطب الدین برہمچاری
 علیہ الرحمۃ (علم محترم امام النور شیخ المنطق شارح بخاری صدر العلاء حضرت
 علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمۃ والرضوان) نے نمایاں کارنامے انجام
 دیئے۔ علومِ اسلامیہ کی فراغت سے ایک سال پہلے ہی ہندوانہ وضع قطع
 اختیار کر کے بنارس کے سب سے بڑے مندر میں ایک دنیا بیزار پجاری کے
 حیثیت سے داخل ہوئے۔ مندر کے عملے سے جلد ہی دوستانہ مراسم قائم
 ہو گئے۔ عنفوانِ شباب میں شخصیت کی دلاویزی، مردانہ حسن و جمال اور
 پروقار سراپانے سبب سبب کے معاملے کو بڑی آسانی سے طے کر دیا۔ ادا
 دیکھتے ہی دیکھتے پنڈتوں اور پجاریوں کے نورِ نظر ہو گئے۔ حصولِ علم
 کی سچی تڑپ اور حسنِ خدمات نے پجاریوں اور پنڈتوں کو جلد مسح کر لیا۔
 انھیں پجاریوں اور بے حد قابلِ پنڈتوں سے آپ نے چھوٹی سے لیکر بڑی
 بڑی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ مسلسل تین برس تک کڑی محنت اور جانفشانی
 سے ویدانتوں اور پرالوں اور شاستروں پر عبور حاصل

کیا۔ اپنے سینے کو ہندو دھرم کے عجائب و اسرار، حقائق و معلومات کا خزانہ بنا کر مندر سے باہر تشریف لائے۔ علماء و مشائخ کی عام زور و شرس سے الگ ہٹ کر آپ نے اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک نیا میدان منتخب کیا اور اس میدان میں آپ بے حد کامیاب رہے۔ اسلام پر خارجی حملوں کے دفاع میں آپ ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر چٹان ثابت ہوئے۔ ہندو پنڈتوں، مشنر آچاریوں، آریہ سماجوں سے کامیاب مناظرے کئے۔ مخالف اپنے دھرم پر آپ کی وسعت معلومات دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتا۔ انہیں کی مذہبی کتابوں سے اسلام کی حقانیت کو ایسا آشکارا کرتے کہ مذاہب کی تاریخ وادیوں میں بھٹکنے والے مسافروں کی آنکھیں کھل جاتی تھی و صداقت کی مشعل دیکھ کر ہزار ہا ہندو آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام لائے سیکڑوں ہزاروں مرتدوں کو پھر سے خدا کا کلمہ نصیب ہوا۔

شدھی تحریک نے جب آپ کے عہد میں زور پکڑا تو اس کے لئے آپ نے کمر بستہ کسی۔ اپنے پیرو مرشد قطب المشائخ حضرت مولانا سید علی حسین اشرفی جیلانی استاد الکمل حضرت علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی کے حکم پر ملک کے طول و عرض بالخصوص صوبہ پٹیالہ کا طوفانی دورہ شروع کیا۔ سیکڑوں ہزاروں غیر مسلموں کو خلقہ بگوشہ اسلام کیا۔

ارتداد کے اس تیز و تند لہر میں سنا کہ بدایوں یا باندہ کے اطراف میں مسلمان شردھانند کے فتنے شدھی کا شکار ہو رہے ہیں اور دو ایک مسلمان مرتد بھی ہو گئے ہیں۔ اس خبر و حشت اثر نے آپ

کو تڑپا دیا۔ فوراً اپنے ایک شاگرد کو لے کر اس مقام کے لئے روانہ ہو گئے۔ گاڑی سے اتر کر اسٹیشن کے ایک گوشے میں جا کر اپنا مخصوص مشائخانہ لباس اتار کر یہ تاکید کی کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں یہیں رک کر میرا انتظار کرنا۔ اس کے بعد آپ نے شام کے دھندلکے میں بھیس بدلا۔ پورے جسم میں بھھوت ملا۔ ماتھے پر قشقہ گلے میں چندن کی نالا ڈالی۔ ایک دیوتا کا روپ دھارن کیا۔ پھر اس دیوتلکے چتکار نے ایک مسلمان کے بدلے میں سیکڑوں ہزاروں غیر مسلموں کو اسلامی برادری میں داخل کیا۔ وہ بدنصیب جو شر دھانندگی چیرہ دستیوں کا شکار ہو گئے تھے اسلام کی ذولبت سے وہ بھی شرفیاب ہو گئے۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے یعنی ۱۹۳۳ء میں «شدھی سنگٹھن» تحریک کا آغاز ہوا۔ منصوبہ بند طریقے پر مسلمانوں کو قتل مرتدا اور اقتصادی و معاشی طور پر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی ہم شروع ہوئی تاکہ برصغیر سے ان کے وجود کو پاک کر دیا جائے۔ یا اگر نہیں تو اس حال میں کہ خود ان کا وجود ان کے لئے ایک مستقل سوہان روح بنا رہے۔ آپہیں آنسو سسکیاں کراہیں ان کا مقدر بن جائے۔ اگند تجارت کا خواب دیکھنے والے چند جید متعصب فرقہ پرست جنونیوں نے ہندوؤں، بودھوں، اور سکھوں کے تعاون سے ایک عظیم تر ہندو قومیت کی بنیاد رکھنے کے لئے مسلمانوں کے خلاف ایک خوفناک سازش کی۔ پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج نے اس عظیم فتنے کو جنم دیا۔ وہی پنڈت دیانند جس نے سیتا رکھ پرکاش

نامی پندنام زمانہ کتاب لکھی۔ جس میں اس نے اسلام اور بانی اسلام
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے نکالے
 بڑے ہی دلاؤ اور پیرائے میں محسن انسانیت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 کی بارگاہِ عظمت پناہ میں گستاخیاں کیں اور یہودہ الزامات سے اپنے
 دامن کو دامن دار کیا۔ جس کا مسکت، مدلل اور دندان شکن جواب
 صدر الافاضل فخر الاماثل حضرت علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی
 علیہ الرحمہ نے بڑی تحقیق و تفصیل سے دیا۔ جو موقر جریدہ پندرہ روزہ
 ”السواد الاعظم“ میں برابر شائع ہوتا رہا ہے۔

تحریکِ خسافت، تحریکِ ترکِ حوالات، تحریکِ ترکِ گاوگوشی کی
 ہلاکت آفرینیوں کے بعد تحریکِ شدھی سنگٹن کا فتنہ بڑی شدت کے
 ساتھ رونما ہوا۔ جس نے اسلامیان ہند کو بے چہرہ کر رکھا دیا۔ شروع
 شروع میں وہ فتنہ ایک آدمی کی شکل میں رونما ہوا۔ دیکھتے دیکھتے
 طوفان بن گیا اور پھر ۱۹۲۵ء میں دیانند کے صد سالہ تقریب کے
 موقع پر ہندوستان کے گوشے گوشے سے فرقہ پرست مذہبی جنوںوں
 کے اجتماع نے اسے بگولے کی شکل دیدی۔ پھر وہیں سے ہندوستانی
 مسلمانوں کی اقتصادی تباہی، معاشی بددعا، مذہبی زبوں حالی اور
 ایمان کی تباہی کا ایک نینر دور شروع ہوا۔ صوبہ یوپی خصوصاً
 اس تباہی کے لپیٹ میں آیا۔ لشت پھسکت کے ساتھ ہی ساتھ
 ہزاروں لاکھوں مسلمان مرتد ہوئے۔ العیاذ باللہ العظیم
 یوں تو اس تحریک میں جو ناپاک تحریک تھی حصہ لینا۔ ہر
 متعصب، فسادی، فرقہ پرست غیر مسلم اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔ ہندو تو

کے ورغلانے پر بڑے بڑے ہندو بہاجنوں، ساہوکاروں اور بیوں نے اس تحریک کے لیے اپنی تجزیوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ مگر جس انداز میں سرگرمی پنڈت کالی چرن، رام چندرا، لالہ منشی رام، شردهانند دھرم بھکشو لکھونی، لالہ گوپی ناتھ امر دہی نے دکھائی یہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔

شردهانند نے تو ایسی تیزی کا مظاہرہ کیا کہ خود دیا نند اس سے پیچھے رہ گیا۔ اس نے اس تحریک کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اور اس کے پیچھے اتنی مستعدی سے پڑا کہ شردهانند اور شدھی تحریک ایک وجود کے دو نام ہو کر رہ گئے۔

یہ شخص مشرقی پنجاب کا رہنے والا تھا۔ تحریک ترک موالات (جو دراصل ہندوؤں کی تحریک تھی) اس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ جامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر محمد علی جوہر کے ساتھ ترک موالات کی حمایت میں زوردار تقریر کی۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کی مصنوعی ہمدردی کا چولہا اتار کر پھینکا اور کل شئی رچج اٹی اٹھ۔ کے مطابق اپنی اصلیت پر آگیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب یہ کھل کر سامنے آیا تو اس کے روپ کے یہ غدو خال ملاحظہ ہوں :-

۱۔ شدھی تحریک کا اصل رُوح رُواں جس کا مقصد ہندوستانی نسل کے مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔

۲۔ تحریک سنگٹھن میں نمایاں حصہ لیا جس کا مقصد ہندوؤں سکھوں اور بودھوں کے تعاون سے ہندوستان سے مسلمانوں

کو نکال کر عظیم تر ہندو قومیت کی بنیاد رکھنا تھا۔

۳۔ دہلی سے اخبار "تیج"، نکالا جس میں ایسے مضامین شائع کئے جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملے کئے۔ (اور تیج دیکھی دہلی کا آج بھی یہی دستور ہے)

۴۔ اس کے بیٹے نے ہندی زبان میں ایک اخبار "ارجن"، نکالا جس کا مقصد سلاطین اسلام کے کردار کو غلط رنگ میں پیش کر کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنا تھا۔

۵۔ اس کے ایما پر ایک اخبار "گرو گھنٹاں" جاری کیا گیا جس کا مقصد وحید مسلمانوں کی مقدس ہستیوں پر ناپاک حملے کرنا تھا۔

۶۔ اس کے ایک چیلے نے جڑبٹ نامی ایک کتاب لکھی جس میں پیغمبر اسلام و دیگر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سخت توہین کی گئی۔

۷۔ اس نے منگل شہزادیوں کے خلاف ڈرامہ اور ناول لکھنے کی ایک تحریک شروع کی اور اس سلسلے میں کئی ناول اور ڈرامے منظر عام پر آئے۔

غرض وہ زندگی بھر اسلام اور مسلمان دشمنی کا سب سے بڑا اعلیٰ وارزما رہا۔ رات دن وہ اسلام اور مسلمانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہا۔ مسلمانوں کو مستانے میں وہ راحت محسوس کرتا۔ اس کی آئے دن نئی نئی خیانتوں اور دلازاروں سے مسلمان تنگ آگئے تھے۔ ان ہی سببے ہو دگیوں اور ہرزہ سرائیوں کی بنا پر دہلی کے ایک غیرتمند مسلمان قاضی عبدالرشید نے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء میں شردھانند کو قتل

کر کے جنم رسید کیا اور خود نتیجہ ۱۹۲۷ء میں بجا شہادت نوش کیا۔
(رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) (حوالہ تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۲۲)

ہرگز نیرد آنکہ دلش زندہ شد از عشق
ثبت است بر خیزیدہ عالم دوام ما
وقت کی بید خطرناک شدھی تحریک نے بر صغیر کے مسلمانوں کو ہلاک
رکھ دیا۔ اس تحریک میں مجموعی طور پر ساٹھ چار لاکھ مسلمان مرتد ہوئے۔
لشنت پھکنت فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری کا تو کوئی بے
ریکارڈ ہی نہیں۔

اس خطرناک تحریک کو کچلنے اور اس کی ہلاکت آفرینیوں سے
امت مرحومہ کو بچانے کے لیے سواد اعظم اہلسنت و جماعت کے علماء و
مشائخ پیران عظام دیوانہ وار آگے بڑھے اور بڑی پامردی اور استقلال
کے ساتھ اس طوفان بزنیز کا رخ موڑ کر امت مسلمہ کو ایک بڑی
تباہی سے بچالیا۔ اس خصوص میں جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی
جماعت اشرفیہ حلقہ اشاعت الحق اور انجمن خدام الصوفیہ نے تاریخ
ساز کردار ادا کئے۔

صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی،
تجہ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خان بریلوی، مفتی اعظم ہند حضرت
مولانا مصطفیٰ رضا خاں صاحب، حضرت مولانا پیر سید جماعت علی
شاہ محدث علی پوری، تاج العلماء حضرت مولانا محمد عمر نعیمی، شیخ
المشائخ حضرت پیر سید علی حسین اشرفی، مبلغ اسلام حضرت مولانا
شاہ عبد العظیم صدیقی میرٹھی، حضرت مولانا مفتی احمد صدیقی میرٹھی،

حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب، حضرت مولانا ثار احمد صاحب کا پوری، حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب، حضرت مولانا ہتید قطب الدین برہمچاری، مولانا غلام عبدالقادر اشرفی، حضرت میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی وغیرہ نے حیران کن کارنامے انجام دیئے ان نفوس قدسیہ نے اس زبردست فتنے کو مکمل طور پر کچلنے کے لئے اپنے آپ کو بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالا۔ ان بزرگوں نے اس کے مکمل استیصال کے لئے ملک میں طوفانی دورے کئے سیکڑوں مبلغ میدان ارتداد میں اتار دیئے اور اپنے جیب خاص سے بیسٹھار روپے خرچ کر کے اسلام اور مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ فاضل مراد آبادی اور محدث علی پوری علیہما الرحمۃ نے تو آگرہ کو ایک طویل عرصے تک ہیڈ کوارٹر بنا کر مقہرا، بھرت پور، گویند گڑھ، بے پور، کشن گڑھ اور اجیر شریف کے اطراف و جوانب میں مسلسل دورے کئے اور مبلغین بھیجے۔ براہ راست اس فتنے کو کچلنے کے لئے اور بھی متعدد طریقے اختیار کئے گئے۔

- ۱۔ وید حکیم کا بھیس بدل کر ۲۔ معارج حیوانات کا پہرہ بھر کے۔
- ۳۔ سادھوؤں کا روپ دھارن کر کے ۴۔ گویوں کا بھیس بدل کر۔
- غرض جہاں جیسی ضرورت محسوس کی گئی۔ مسلمانوں کو بچانے کے لئے ویسا ہی حربہ استعمال کیا گیا۔

ان نفوس قدسیہ کی سرفروشی اور مجاہدانہ کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساڑھے چار لاکھ مرتدین کو پھر اسلام کا کلمہ نصیب ہوا۔ اور ڈیڑھ لاکھ غیر مسلموں کو اسلام قبول کیا۔ بھیس بدل کر جو کوششیں ہوئیں اسکی

وَجَبَّ سَیْئَرُہُمْ بِمَا كَانُوا عَمَلُوا۔ اسلَام لَانِی كَی بَعْدُ جَوَسْنَد
 جَارِی كِی جَاتِی اس كَی چَارِ حَصَّی ہوتے اِیك حَصَّہ اس نُو مُسْلِم كُو دِیَا جَانَا
 دُوسْرَا حَصَّہ صُدْر دُفْر بَیجَا جَانَا۔ تِیسْرَا حَصَّہ رِیكَا رُڈ مِی رَكھَا جَانَا اور
 جوتھے پَر نُو مُسْلِم كِی چُونِی كَاٹ كَر لُگَانِی جَاتِی۔

اسلام کی اشاعت میں صرف یہ حصہ اہلسنت کا ہے جن کے
 سرخیل قائد اور امام برصغیر کے مشہور عاشق رسول اعلیٰ حضرت امام
 احمد رضا بریلوی ہیں، جبکہ جمعیتہ العلانی ملاؤں، وہابی ازمام کے
 علمبرداروں، وقت کے شیخ الہندوں، شیخ الاسلاموں، امام
 الہندوں اور ان کی ذریات کا ذور ذور تک پتہ نہیں تھا۔ دُوزاؤل
 ہی سے بیظالم توحید کا زبانی ٹھیکہ دار بنتے اور شرک و بدعت کے
 پیغمے میں ایسے مبتلا ہیں کہ انھیں کچھ کرنے کی نہ کل کچھ فرصت تھی اور
 نہ آج۔ بنام اسلام سی آئی اسے کے روپے نے زمین دوز تباہ کاری
 اسلام کا ایک طویل عرصت تک سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ اُن کے اکابر
 نے وطن اور ملت فروستی کے ذریعے انگریزوں سے ہاتھ ملالیا تھا۔ اور
 ان ظالموں نے چند غلاقت کے لوٹھروں کی خاطر اندر ہی اندر فروت
 پرستوں سے پیٹھ ملالیا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ایسے تاریک ایام، ہوشربا
 ماحول اور ہلاکت خیز دور میں تاریخ کے اجزائے پریشاں میں انسے
 پردہ نشینوں کا ذور ذور تک نام نہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کی فراوانی اور
 پریس و قلم کی توانائی کی بدولت ذرائع ابلاغ پر تنہا اجارہ داری نیز
 غلط بیہودہ اور لائینی صحافت نے بزدلوں کو شیردل، وطن فروشوں کو
 وطن پرست اور چڑھتے سورج کے پجاریوں کو مجاہدین صف شکن بنا دیا

ہے۔ اس افسوسناک جلی اور بقلم خود تاریخ نے دین فروشوں کو سرفروشی اور حالت کی ستم ظریفی نے ایمان کے ڈاکوؤں کو اسلام کا سب سے بڑا غازی مجاہد اور شہید بنا دیا ہے۔

ہائے رے گردش ایام کل تک وہ لوگ جو وطن فروشی اور ملت کی نیلامی کا سٹہ لگاتے تھے، آج وہی اسلام کے سب سے بڑے علمبردار اور وطن کے پاسبان کا بہروپ بھرے تاریخ پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔

اشاعتی اور صحافتی مجاہد پر سواد اعظم اہلسنت و جماعت کے بے حسیت بے بسی، سستی، تن آسانی، باہمی قدر کی پیمائش، افسوسناک تغافل اور مجرمانہ سکوت نے آج وہ دن دکھایا ہے کہ اندھیرا اجالابن گیا اور ہے اور رات کو دن کی جگہ مل گئی ہے۔ ہماری غفلت شعار یوں اور مجرمانہ کوتاہیوں کی وجہ سے تاریخ کے وہ کچھار جہاں صرف شیروں کی دباؤ سنائی دیتی تھیں۔ آج وہی زارع وزغن کی کائیں کائیں اور گندڑوں لوٹروں کی کوڑا اور مہکا ہنواں سے بارِ سماعت بنے ہوئے ہیں۔

ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری

خوشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

تحریک شدھی میں بری طرح سے ناکامی کے بعد فرقہ پرستوں

امن دشمنوں اور متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں کی دلازاری کا

باقاعدہ تحریری سلسلہ شروع کیا جس کی شہادت میں آریہ سماج

کی ان کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ترک اسلام، تہذیب الاسلام، مسیتارتھ پرکاش، آریہ تیرپری
آریہ مسافر جالندھر، آریہ مسافر میگزین وغیرہ وغیرہ۔

غیرت مند مسلمانوں نے بڑی اولوالعزمی اور سرفروشی کیساتھ
ان گستاخان رسول کا مجاہد کیا۔ چنانچہ بارگاہ رسول کے مشہور گستاخ
راجپال کو غازی عظیم الدین نے اس کی دوکان میں دن دہائے بوکروں
کی موجودگی میں گھس کر اس دشمن اسلام کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد عشق
رسول میں مست ہو کر مسکراتے ہوئے پھانسی کے پھندے کو چوم لیا۔ ۲۵
لاکھ مسلمانوں نے عقیدت و احترام کے آنسوؤں کے ساتھ انھیں سپرد
خاک کیا۔ ایسے عاشق کی نماز جنازہ کے لئے ڈاکٹر محمد اقبال جیسے دیدہ و
نہ سید محدث دیدار علی تمیز رشید اعلیٰ حضرت بریلوی کو صحیح حقدار قرار دیا
لیکن انسانی سیلاب کے اس ریلے میں حضرت اپنی تمام تر کوششوں کے
باوجود جائے نماز تک نہیں پہنچ سکے۔ کافی انتظار کے بعد کسی دوسرے
خوش نصیب کے حصے میں یہ سعادت آئی کہ عاشق کا جنازہ بے ذرا دھوم کے نکلے۔
سرخاندین کوئی کے ایک غیر تمند نوجوان قاضی عبدالرحیم نے جہنم
رسید کے اسکی مستقل اذیت سانیوں اور دلازاروں سے مسلمانوں کو نجات دلائی
بھولانا تھ خبیث کو امیر احمد اور عبداللہ نام کے نوجوانوں نے ٹھیک کیا۔
قصور کے پالامل کو محمد صدیق نامی ایک نوجوان اور کراچی کے تھورام کو
غازی عبدالقیوم نے کیفر کردار تک پہنچایا۔ خدارمت کندایں عشقانِ پاکینت
اللہ ان سے راضی ہوا اور یہ اللہ سے راضی ہوئے سے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی وہ ابھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

جلوہ رنگین کی ہمتا

روایتی قصے کہانیوں کی طرح کرامہ بنت عمرو بن عبد المسیح بن قیس بن حارث بقیلہ کے حسن جہاں سوز کا شہرہ عراق کے مشہور شہر حیرہ کے مرغزاروں سے نکل کر عرب کے ریگزاروں تک پھیل چکا تھا۔

مہوشوں، لالہ رخوں، سرودقوں، سیسے تنوں، گل بدوں میں اس کے ناز و انداز، دلبری و دلربائی، دلکشی و رعنائی، حسن ادا اور باتکین کا آوازہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

تم چاندنی ہو، پھول ہو، نغمہ ہو، شعر ہو

الذریعے حسن ذوق میرے انتخاب کا

حسرت دید کے تماشے لئے دیوان گان کو پہنچا، اس گلی کا طواف کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ جلوہ بے تاب کی ایک جھلک ہی سہی؛ جلتی آنکھوں کے لئے کچھ تو سامان تسکین فراہم ہو سہ

تمھاری دید ہی مقصد رہا، جو جن نگاہوں کا

وہ چشم منتظر پتھر اگیں کیا تم نہ آؤ گے

دلبری و دلربائی کے ساتھ خرام ناز کا محشر، جانے کتنے دلوں کو زیروزہ بر کر جاتا، اداے جانانہ کے ساتھ بہانے ناز کا تبسم، دلوں کے آنگن میں موسم گل کا سماں باندھ دیتا سہ

وہ جب آئے گا تو اس کی رفاقت کے لئے
 موسم گل میرے آنگن میں اتر آئے گا
 اور جب کبھی زگس مست ناز گیا آلود انداز لے اپنے پلکوں کی چلن کو نیچے
 سے اوپر کرتی تو مشتاقانِ دید کی آنکھوں میں ایسے کی جانے کتنی ہمیں
 جلتے لگتے ہیں

زگس ہے چشم، سرو ہے قد، گل خدا ہے
 نام خدا وہ شوخ سر پایا بہار ہے

سید العرب و العجم آقائے کائنات فرمودات حضور رحمت عالم نور مجسم
 سرور عالم جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حیات
 ظاہری سے پردہ فرمانے کے بعد۔ افضل البشر بعد الانبیاء، حضرت سیدنا
 ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی قیادت آپ کے ہاتھوں
 میں آئی۔

اپنی دو سالہ خلافت راشدہ کے ذریعے دور میں ایمانی جزات
 اور بے پناہ عزیمت و استقامت کا جو عظیم الشان مظاہرہ آپ نے فرمایا
 عقل و تاریخ انسانی دونوں آج تک حیران ہیں۔ حالانکہ آپ اس وقت
 عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں عام طور پر انسان قوی
 مضحل، اعضاء کمزور، اور قوت فیصلہ جواب دہ جاتے ہیں۔ اس کے
 باوجود آزمائش کی کڑی دھوپ میں جس سرخرونی و کامیابی کے ساتھ
 آپ نکلے یہ سرتا سر توفیق الہی و فیضانِ صحبت رسالت پناہی کی بے
 پایاں برکتیں تھیں ورنہ اتنے مراحل کو کامیابی کے ساتھ تھیل لیجانا

یہ عام انسانی بس کی بات نہیں تھی۔

عبداللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فوراً بعد انتہائی نازک صورت
خال ہوانے کے بدلے ہوئے رُخ اور حالات کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ
کہ بڑے بڑے شجاعانِ عرب کو پسینہ آ رہا ہے حتیٰ کہ فاروق اعظم جیسے
سخت کوش اور استقامت کی کوہ پیکر شخصیت کا انداز فکر بدلانا نظر
آ رہا تھا۔

ایسے عالم میں خدائے ذوالجلال نے اپنے ناقواں بند ابوبکر
کے سینے کو انتہائی مضبوط و ناقابلِ تسخیر چٹان بنا کر اس میں نورِ بصیرت،
عزیمت و استقامت، شہور و آگہی بے مثل، فہم و ادراک، صیج۔ بروقت
قوب فیصلہ کی توانائی و دیعت فرما کر ان کی ذات ستودہ صفات کو اسام
و مسلمانوں کا پناہ گاہ بنا دیا۔ انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں اسلام
کی تحفظ و بقاء کی جو تاریخی جنگ حضرت ابوبکر صدیق نے لڑی ہے۔ اسلام
کے پورے عسکری تاریخ میں اس کی دوسری کون مثال نہیں ہے

یقین حکم عمل پیہم جنت و نجات عالم
جہادِ زندگانی میں تھیں یہ مردوں کی شمشیریں

سرکارِ دو عالم کے جدائی کا یہ صدمہ عظیم کیا کم قیامت تھا کہ منافقین کی
خاموشی کو شمشوں سے نظروں کے سامنے جسدا طہر کی موجودگی ہی
میں بہترین و انصاف کا اقتدار کے حصول کے لیے باہم ایک دوسرے
الچھ کر تلوار بکالنے کے قریب پہنچ جانا۔ فاروق اعظم کے تعاون سے
کمال دانائی کے ساتھ اس قیامت خیز ماحول میں اس پر بروقت قابو

پالینا۔ اس کے بعد فوراً ہی سزد میں عرب کا اپنے اندر سے سارے فتنوں کو
 بیک وقت زمین پر اگل دینا، یعنی جھوٹے مدعیان نبوت کا ظہور اور ان
 کی تباہ کاریاں منکرین زکوٰۃ اور لاکھوں کی فتنہ سامانیاں، قبائل کے قبائل
 کا اسلام سے پلٹ جانا، پھر ان مرتدین کی بلاکت خیزیاں، اسلام
 و مسلمانوں سے تازہ تازہ زخم و مار کھائے ہوئے چھپے و کھلے ہوئے دشمنوں
 کا مشترکہ محاذ اور ان کی غارت گریاں، اور ان سب کا ایک ہی وقت
 میں اسلام کو مٹانے کی پیم کو شششوں کا ظہور اور ایسے عالم میں حضور
 پاک کی اتباع میں اسلام کی فوجی طاقت کو اسلام بن زید بن عمارہ
 کی سپہ سالاری میں وطن سے ذور ملک شام میں لڑنے کے لئے تمام
 وسوسوں، اندیشوں، مصلحتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھیج دینا۔ پھر اس
 فوج کی واپسی کا انتظار کے بغیر اسلام کے اندرونی کافروں، منکروں
 ظالموں، دشمنوں سے اپنی فوجی قلت و تمامت بے سرو سامانی کے باوجود
 لڑائی کے ہر محاذ کو کھول دینا اسلام کی بقا کی جنگ میں رہی سہی
 اسلام کی ساری توانائی کو داؤوں پر لگا کر انھیں جنگ کی آگ میں
 جھونک دینا اہل پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر محاذ پر نسیج و نصرت کا پرچم
 لہرانایا ایسے غیر العقول کا رنارے ہیں جس پر تاریخ آج بھی انگشت
 بندیاں ہے سے

اڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ زگس نے کچھ گل نے
 چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
 اندرون ملک عہد صدیقی کی سب سے خوفناک جنگ۔ جنگ یمامہ جو
 جھوٹے مدعی نبوت مسیلاًہ کذاب سے لڑی گئی جو اتنی خوفناک تھی

کہ اسلامی لشکر کو پے در پے ہزیمتیں اٹھانی پڑیں بالآخر اللہ کی تلوار حضرت خالد بن ولید نے اس لڑائی کا فیصلہ کیا۔ باطل کا کس بل نکلا بد نہاد مسیلمہ کذاب جنم رسید ہوا۔ مسلمانوں کا بھی بھاری جانی نقصان ہوا۔ اس جنگ کی ہلاکت خیزی کا اندازہ اس سے لگا یا جائے کہ شہید ہونے والوں میں صرف شتر حفاظ قرآن تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں حفاظ قرآن کی شہادت ہی تدوین قرآن کا باعث ہوئی اس جنگ کے انجام نے منکرین مانعین ظالمین، باغیوں اور تمام سرکشوں کے کس بل نکال دیے۔ اب پھر جزیرہ انعب میں کوئی طاقت نہیں رہ گئی جو اسلام سے آنکھیں ملا سکے۔ سارا عرب ایک ہارنے سے پھر مطیع و فرمان بردار ہو گیا۔

حضرت خالد بن ولید جنگ یمامہ سے جب فارغ ہو گئے تو خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر صدیق کا حکم نامہ پہنچا کہ اپنی فوج لے کر عراق کی محاذ پر روانہ ہو جاؤ جہاں پہلے ہی سے حضرت مشنی بن حارثہ شیبانی حضرت ابو بکر صدیق کی اجازت سے اپنے جیالوں کے ساتھ عراق کے اندر گھس کر ایران کی عظیم طاقت کو لٹکا رہے تھے اور مسلسل کئی محاذ پر ان سے اپنی بے پناہ جنگی قیادت کا لوہا منوا چکے تھے۔

خلیفۃ المسلمین کے حکم پر خالد بن ولید راستے کی ہرز کاوش پر قابو پاتے ہوئے راستے کی مختلف آبادیوں اور بستیوں کو اسلامی ریاست میں شامل کرتے ہوئے عراق کے بے خدا ہم شہر حیرہ میں پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیرہ کو

کو فتح کر لیا

اسے فوج دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
رکتانہ تھا کسی سے سیل زواں ہمارا
حیرہ کے گرد متعدد قلعے بھی تھے جن کے قلعدار مختلف قبیلوں کے سردار
تھے اور ہر قلعے میں عیسائی عربوں کی فوج تھی۔ حضرت خالد نے اپنے
جاننازوں کو ان میں داخل کر کے ہر قلعے پر اپنا ایک ایک سردار مقرر
فرمادیا۔

چنانچہ ضراب بن لاذر نے قصر امیض کا محاصرہ کیا جس میں ایاس
بن قبیضہ طائی رہتا تھا۔ ضراب بن الخطاب نے قصر عدیسیں کا محاصرہ
کیا جس کا والی عدی بن عدی المقول تھا۔ ضراب بن مقر انہرنی نے
قصر بنو مازن کا محاصرہ کیا۔ جس کا سردار ابراہ بن اکال تھا۔ اور مثنی بن
عاریہ شیبانی نے قصر ابن بقیلہ کا محاصرہ کر لیا۔ جس کا مالک عمرو بن
عبد المسیح بن قیس بن عاریہ بقیلہ تھا۔ یہ چاروں قلعے تھے تو اہل
فارس ہی کی عملداری میں کہ اس وقت عراق ملک فارس ہی کے
تحت تھا۔ مگر یہ اپنے ہمدون میں آزاد تھے جو نوشیرواں عادل کے
جیتے جاگتے شاہکار تھے۔

چوں نوشیرواں عدل کرد اختیار
کنوں نام نیکش ازو یادگار
سزد کرد بدورشس چوں نازم چناں
کہ سید بدوران نوشیرواں
اور یہ ابن عبد المسیح کوئی معمولی آدمی نہیں تھا پورے عراق پر ایسا

قابض ہو گئے مگر اس کے باپ دادا نے ان قلعوں کو بچائے رکھا عراق
 میں رہ کر وہ فارس کی نمائندگی تو نہیں کرتا تھا مگر وہ ایرانیوں
 کے محکوم بھی نہیں تھا۔ بقیہ یہ تینوں قلعے اسی کے زیر اثر تھے۔

بذات خود وہ غیر معمولی طور پر بہادر و جری، طباع، ذہین اور
 حاضر جواب تھا حضرت خالد بن ولید کی ہدایت کے مطابق ان تمام
 اسلامی سرداروں نے ان تمام لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی
 دعوت دی مگر ان لوگوں نے سخی کے ساتھ اسلام قبول کرنے سے
 انکار کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی طرف سے جزیہ کا مطالبہ ہوا کہ اسلام قبول
 نہیں کرتے ہو تو جزیہ دے کر ہماری اطاعت قبول کر لو۔ ہم تمہاری جان
 و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر ان لوگوں نے اسے بھی نہیں
 مانا۔ پھر مسلمانوں نے ان تمام لوگوں کو ایک دن کی بہت دی کہ تو
 غور کر لو۔ مگر وہ اپنی ضد پر اٹھے رہے۔ مجبور ہو کر مسلمانوں نے جنگ
 کا آغاز کر دیا۔

سب سے پہلے دشمن کو موقع دے کر ان پر حملہ کرنے والے ہزار
 بن الا زور تھے۔ بے حد نڈر اور بہادر سردار ان کے طوفانی حملوں نے
 بہت جلد عیسائیوں کو اپنی اوقات یاد دلادی دیکھتے ہی دیکھتے قصر
 ابیض کو ہزار کے جیالوں نے اپنے پاؤں سے روند ڈالا۔

فوجی غیر فوجی پادری اور اب شہری سب امان کے لئے
 چلنے لگے۔ قصر ابیض کا حشر دیکھ کر بقیہ لوگوں کے عقل و ہوش خود
 ہی ٹھکانے لگ گئے اور انھوں نے نہ جانی میں صلح ہی کو اپنی سلامتی
 کے لیے ضروری سمجھا۔

چنانچہ تمام قلعے کے سرداروں اور معزز لوگوں کا ایک وفد عمر بن
عبد المسیح کی قیادت میں حضرت خالد بن ولید کی خدمت میں صلح کی نیت
سے حاضر ہوا۔

عمر بن عبد المسیح کافی طویل العمر تھا۔ ایک روایت کے مطابق
اس وقت اس کی عمر دو سو سال تھی۔ حضرت خالد نے اس کی بڑی
دلچسپ گفتگو ہوئی۔ اس قدر طویل العمری کے باوجود اس کی نگاہیں
ذہانت، بے خوفی اور حاضر جوابی سے حضرت خالد متاثر بھی ہوئے اور
خدمت سے زیادہ شوخی پر بھلائے بھی!

حضرت خالد نے اس سے پوچھا

تم کہاں سے آئے ہو؟

اپنے باپ کے پشت سے!

تم کہاں سے نکلے ہو؟

اپنی ماں کے پیٹ سے!

جھٹلا کر۔۔ ارے تم پر افسوس تم ہو کس چیز پر؟

ہم زمین پر ہیں!

تمہاری عمر کیا ہے؟

سیکڑوں سال!

اس طویل عرصے میں تم نے عجیب ترین بات کیا دیکھی ہے؟
میں نے دمشق سے حیرہ تک مسلسل آبادیاں دیکھیں اور یہ دیکھا کہ ایک
عورت حیرہ سے سفر کرتی ہے مگر روٹی کے سوا اسے کوئی توشہ نہیں
دیا جاتا۔

تم کچھ عقل سے بھی کام لیتے ہو۔

کیوں نہیں! عقل سے بھی کام لیتا ہوں اور قید سے بھی!
میں تم سے سوالات کر رہا ہوں۔

اور میں آپ کو جواب دے رہا ہوں۔

اچھا یہ بتاؤ کہ تم صلح چاہتے ہو یا جنگ!
ہم صلح چاہتے ہیں۔

تو پھر ان قلعوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟

یہ قلعے ہم نے اس لئے بنائے ہیں کہ کوئی بے وقوف اگر آئے تو ہم اسے
قید کریں اور اگر کوئی سمجھدار آئے تو اس سے نچ کر چلا جائے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت خالد بن ولید نے انہیں اسلام کی دعوت
دی اور فرمایا کہ اگر تم نے اسلام قبول کر لیا تو ہمارے تمہارے حقوق
برابر ہو گئے۔ اور اگر یہ بات تمہیں پسند نہیں تو پھر تمہیں جزیہ دینا پڑے
گا۔ اور اگر تم اس سے بھی انکار کر دے گے تو یاد رکھو ہم تمہارے لئے
ایسی قوم لائے ہیں جو موت کو ایسے ہی محبوب رکھتی ہے جیسے تم شراب
نوشتی کو۔

ہم لوگ آپ سے لڑنا نہیں چاہتے ہیں۔

اس کے بعد ان لوگوں اور حضرت خالد سے صلح کے معاملات پر گفتگو
شروع ہوئی اور معاملات صلح طے ہونے لگے کہ اسی درمیان ایک
ادمیرل عمر کا سپاہی حضرت خالد بن ولید کے سامنے کھڑا ہوا۔

حضرت خالد نے اس سپاہی سے آمد کی عرض دریافت کی۔

اے سالار اعظم اللہ کی رحمتیں آپ پر ہوں میرا نام شوہل ہے میں

ایک گزارش لے کر خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

یہاں پر بیماری فسخ مکمل ہو گئی ہے نا؟

بے شک! سارے معاملات طے ہو چکے ہیں اب صلح نامہ لکھا جانے والا ہے تو پھر اے سالار اعظم شہزادی کرامہ ہمیں دے دی جائے۔

بڑی حیرت کے ساتھ حضرت خالد نے اس عام سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیوں بھائی! شہزادی کرامہ تمہیں کیوں دی جائے۔

اس لیے کہ میرے آقا و مولے حضور رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے بہت پہلے شہزادی کرامہ عطا فرما چکے ہیں۔

دیکھو میرے بھائی تم ایک بڑا دعویٰ کر رہے ہو کہ کرامہ کوئی عام سی عورت نہیں ہے بلکہ حیرہ کی شہزادی ہے جب کہ اس کے مقابلے میں تم

ایک عام سپاہی ہو۔ کیا تم اپنے اس دعویٰ کا گواہ پیش کر سکتے ہو کہ واقعی اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کرامہ کو تمہیں

عطا فرما دیا ہے؟

کیوں نہیں یا امیر المومنین! جس وقت میرے آقا نے یہ فرمایا تھا اس وقت میں اکیلا نہیں تھا اور لوگ بھی تھے۔ اور شاید اس میں سے کچھ لوگ یہاں ہوں بھی۔

تو جاؤ کم از کم دو گواہ ضرور پیش کرو۔ اگر تم نے گواہ پیش کر دیے تو کرامہ تمہیں دے دی جائے گی۔

تلاش کے بعد اسلامی فوج میں دو گواہ ایسے مل گئے جنہوں نے حضرت خالد بن ولید کے سامنے یہ گواہی دی کہ بے شک اللہ کے

مقدس رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے غیرہ فتح سے بعد کرامت
عبدالسیح کے لئے شومیل سے وعدہ فرمایا تھا۔

صورت واقعہ کی تفصیل میں جاتے ہوئے ان لوگوں نے بتایا کہ
ایک دن ہم لوگ آقائے کائنات مصطفیٰ جانِ رحمت (اجسادنا و ارواحنا
فداہ) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ رحمت میں حاضر تھے۔ اشنا
گفتگو ذکر چل پڑا اسلامی فتوحات کا باتوں باتوں میں فارس کی شہنشاہ
اور کسری ایران کا ذکر نکل پڑا۔ ہم میں سے کسی نے عرض کیا یا رسول
اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان اگر حیرہ ہاتھ آجائے تو کسری پر کاری
ضرب لگائی جاسکتی ہے۔

مشہور مورخ ابن جریر طبری و بلاذری کے مطابق غیت کی
خبریں دینے والے نبی نے ارشاد فرمایا عنقریب حیرہ مسلمانوں کے
ہاتھوں فتح ہو جائے گا۔ پھر اسی محفل میں حیرہ کی اہمیت اس کے
زرد و نواح کی خوبصورتی و شادابی کا ذکر چھڑ گیا۔

عروبن عبدالسیح وہاں کی مشہور شخصیت تھی اس کی ایک بیٹی
کرامہ تھی۔ جو رعنائی ہشبات کی پیکر، صبح مسرت کے اجالوں کی
طرح روشن اور جس کی خوبصورتی کی داستان دور دور تک
سہی ہوئی تھی۔

شاید کہ میرے لب پہ پھر تیرا نام آیا
کیوں صحنِ نایاب میں بجنے لگی شبنامی

اب مقدس و بابرکت محفل میں یہ سادہ لوح دیہاتی بھی بیٹھا ہوا
تھا اس نے جوں ہی سرکار سے حیرہ فتح ہونے کی خوشخبری سنی تو بے

بھولپن سے کہنے لگا یا رسول اللہ کیا حیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو جائے گا

بے شک حیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوگا۔

یا رسول اللہ تو قلعہ بقیلہ بھی فتح ہو جائے گا۔

ہاں قلعہ بقیلہ بھی فتح ہو جائے گا۔

یا رسول اللہ تو عبد المسیح کی بیٹی کرامہ ہمیں دیدی جائے سر کا مسکرائے لگے

یوں مسکرائے جان سی کیدر میں پڑ گئی

یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

مسکراتے ہوئے نرمایا اچھا فتح کے بعد کرامہ تمہیں دیدی جائے گی۔

عمر بن عبد المسیح اسے اچھی طرح سے سن لو۔ رسول اللہ کا

وعدہ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ تمہیں ہر جہاں میں اپنی بیٹی

کرامہ کو اس شخص کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔

حضرت خالد کے اس فیصلے نے اہل حیرہ کو ایک نئی پریشانی

میں مبتلا کر دیا۔ عبد المسیح کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اسے شدید زہنی

جھٹکا لگا قریب تھا کہ وہ اسے اپنی اہانت سمجھتے ہوئے سختی سے ہٹکا

کر دیتے۔ مگر حضرت خالد کے مستحکم عزائم اور خوفناک سنجیدگی نے

انہیں حواس باختہ کر دیا۔ کافی غور و خوض کے بعد بالآخر ابن عبد المسیح

نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کرتے ہوئے کہا ٹھیک ہے کرامہ آپ کی

خدمت میں پہنچادی جائے گی جوں ہی یہ خبر وحشت اثر شاہی

محل میں پہنچی وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا

کہ شہزادی کرامہ ایک بدو عرب کو دی جائے۔ فریب تھا کہ ایک ہنگامہ دار
 و گیر بڑپا ہو جائے کہ شہزادی نے سمجھاتے ہوئے کہا میرے عظیم باپ نے
 میرے بارے میں بڑا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ میری طلب کرنے والا
 کوئی اتحق ہی ہوگا شاید کسی سے اس نے میری جوانی کے تذکرے سن
 لیے ہوں گے اور اپنی فطری حماقت سے جوانی کو کوئی سدا بہار چیز
 سمجھ رہا ہوگا۔ اس نے میری جوانی و حسن کے قصے تو سنے لیکن زمانہ نہیں
 دیکھا، میرے جلوہ حسن کی تشہیر کا زمانہ، میرے عالم شباب کا زمانہ تھا
 جب رگ و پے میں آتش سیال بجلیاں بھرے ہوئے تھے
 پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
 پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

مجھے اس بدو کے پاس لے چلو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اپنے محل میں
 واپس آجاؤں گی۔ کینزوں کے جلو میں شہزادی جوں ہی شویل کے
 پاس پہنچی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے حیرت کا جھٹکا اور بدن
 میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس سادہ لوح عرب کے سامنے حسن و ادا دکھائی
 و دنیا ویزی اور رعنائی شباب کے پیکر مجسم کے بجائے کینزوں کے
 جلو میں ایک انشی سالہ باوقار ضعیفہ خاتون کھڑی تھی جس کے چہرے
 پہ جھڑیاں اور بال سفید ہو چکے تھے اور جس کے رخ زینا کے نقوش اول
 باوقار سر پہ پرہیزگاری کی خوشگوار کہانیاں رقم تھیں
 ڈوبا ہوا ہے دل مرا یادوں کی جھیل میں
 آنکھوں میں خواہشوں کی تھکن کا خار ہے
 میں کرامہ بنت عبد المسیح ہوں سنا کہ تم نے ہماری طلب کی ہے تو آخر میں

اٹھی سالہ بڑھیا تمہارے کس کام کی؟ کیا بہتر نہیں ہوگا کہ مجھ سے کوئی رقم
لے کر مجھے آزاد کر دو۔

بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے شوہل نے کہا۔ کیوں نہیں!
لیکن رقم مقرر کرنے کا اختیار مجھے ہوگا۔

ہاں ہاں جتنا چاہو مقرر کر لو۔
تو سن لو میں اپنی ماں کی اولاد نہیں اگر تم سے ایک ہزار درہم

کم لوں۔

کیا ایک ہزار درہم زیادہ نہیں۔

نہیں ہرگز نہیں اس سے ایک درہم بھی کم نہیں ہوگا۔

شہزادی کا اشارہ پا کر ایک کینز محل سے بھاگ کر ایک ہزار
درہم لا کر شوہل کے آگے رکھ دیا۔ وہ سادہ لوح عرب جس نے اپنے
زندگی میں ایک ہزار درہم نہیں دیکھا تھا۔ اتنے درہم اکٹھا دیکھ کر بڑا
حیران اور ساتھ ہی بہت خوش بھی ہوا۔ اور خوشی خوشی شہزادی
کو واپسی کی اجازت دی۔ شہزادی بیتے ہوئے دنوں کا تصور لے
ہوئے شاہی محل میں واپس ہوئی۔

آج ٹوٹے ہوئے پہنوں کی بہت یاد آئی

آج بیتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا

شوہل وہ ایک ہزار درہم لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے اور
اپنا کارنامہ بیان کرنے لگے۔ ارے بھائی میں تو پھنتے پھنتے بچ گیا
وہ کبخت جس کی خوبصورتی کی اتنی دھوم مچی ہوئی تھی وہ تو اسی
سالہ بڑھیا نکلی۔ میرے ساتھ بڑا دھوکہ ہوا۔

لیکن وہ بڑھی بھی کیا یاد کرتے گی میں نے پورے ایک ہزار درہم اس کے
وصول کر کے تب چھوڑا ہے

اب کون کرے جلوہ رنگین کی تمنا
تم سے کہیں حسین تھکتے خواب کا عالم

کیا صرف ایک ہزار درہم لے کر تم نے اسے چھوڑ دیا۔ ارے بدھو وہ
شاہی خاندان کی عورت تھی اس سے چلبے جتنے ہزار درہم چاہتے
لے لیتے لیکن تم زندگی بھر بدھو کے بدھو رہ گئے۔

اچھا تو ایک ہزار سے بھی زیادہ درہم ہوتا ہے ہاں ہم کو تو یہی معلوم
تھا کہ ایک ہزار سے زیادہ درہم ہی نہیں ہوتا
وہ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اسے خدا

بلاذری نیرا بن بربطبری نے تاریخ طبری کے حصہ دوم میں
کرامت کے حوالگی پر تفصیل گفتگو کی ہے۔

علم غیب مصطفیٰ کے منکرین و مانعین کو اس عظیم واقعے سے
عزت حاصل کرنا چاہئے۔ آخر وہ تاریخ کی ان جیسے صدی حقیقتوں کو
کب تک جھٹلاتے رہیں گے۔ اور بھری دوپہر میں سورج کی حقیقت
سے انکار کی دھاندلی کب تک چلائیں گے۔

گردہ بیند بروز شپہ چشم
چشمہ آفتاب را چہ گناہ



کفن چور

بنو انصار کا وہ گل رعنا نسوانی وقار اور جمال و دلکشی کا پیکر تھا
 بن کر جب شباب کی ابتدائی دہلیز تک پہنچا تو جانے کتنی آنکھوں
 میں اُمید و اشتیاق کی تمنائیں مچنے لگیں سے
 ذہن میں انگریزائیاں لیتا ہے جب تیرا خیال
 شاخ لب پر مرے کھلتے ہیں تبسم کے گلاب
 حسن کی قوت تسخیر تو یوں ہی بڑی ظالم ہوتی ہے اور جب اس میں
 شرم و حیا اور غیرت کی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ دو آتشہ ہو جاتی
 ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی وقت و حالات کی دھڑکنیں بھی بے
 ترتیب ہو جاتی ہیں

ع خندہ گل جنبش لب بوئے گل تقریر ہے
 اس کے پاکیزہ کردار اور مثالی حسن کا تذکرہ وفا کی خوشبو کی طرح
 خاندان عزیز و اقارب سے آگے نکل چکا تھا جس کی وجہ سے بہت
 سارے خوابوں اور خیالوں پر از خود اس کا قبضہ ہو چکا تھا
 دل میں دھڑکن کی طرح آنکھ میں آنسو کی طرح
 تم میرے پاس رہو پھول میں خوشبو کی طرح
 مگر ابھی اس کا شبستان وجود بابل کے آنگن ہی کو مہکارا ہا

تھا۔ اس رعنائی شباب کی پھٹکی چاندنی سے کسی اور کے دروہام منور
 نہ ہو سکے تھے البتہ دل کے بہت سے ویران دریچے اپنے صحن تمنائیں
 اس کے وجود کی خوشبو کے لئے شدت سے بے چین تھے سے

تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جان حیات
 جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکنا دیکھوں

کاشانہ محبت میں زلفوں کے بکھرنے کا موسم قریب آچکا تھا۔ فطرت کی
 خانندیاں اپنی تیاریاں مکمل کر چکی تھیں۔ منشا تخلیق کی تکمیل میں
 کلی پھول بننا چاہ ہی رہی تھی کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسکی
 ہستی کے تار و پود کو بکھیر دیا بہت سارے وہ دل جو اس کے پاکیزہ

تصور سے دھڑکتے تھے زخمی ہو کر لہو لہان ہو گئے یہ
 آنکھیں کھلیں تو جاگ اٹھیں حسرتیں تمام
 اس کو بھی کھو دیا جسے پایا تھا خواب میں

رات اپنا سیاہ بازو پھیلائے کائنات کو اپنی آغوش میں لینے
 کے لیے رُواں رُواں تھی۔ شب کی سیاہ زلفیں ابھی کمر تک نہیں۔
 پھیلی تھیں۔ کہ رات کے اسی سُنٹائے میں ایک سایہ محتاط انداز
 میں چاروں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ
 ایک قبرستان میں داخل ہو گیا۔

تاریک رات کا پُرہول سُنٹانا سارے ماحول پر مسلط تھا۔
 ایسے وحشت خیز سُنٹائے میں وہ شخص ہر خوف سے بے نیاز ہو کر
 یکے بعد دیگرے قبروں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسا
 لگتا کہ اسے کسی خاص قبر کی تلاش ہو۔ یہاں تک کہ وہ ایک

تازہ قبر پر پہنچ کر رک گیا۔

ارد گرد پھر ایک بار نظریں دوڑا کروہ قبر کی مٹی کو ادھر ادھر بٹانے لگا
جلد ہی قبر کے تختے کو الگ کر کے قبر کے اندر داخل ہو گیا۔ بڑی مشاقی
کے ساتھ کفن کو میت سے اتارا پھر قبر برابر کی اور چل دیا سے

اس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات

جب آخری رفیق بھی دشمن سے بل چکا

ابھی وہ کچھ ہی ڈور گیا تھا کہ اس بے جان جسم کے بے حد پرکشش
سراپے اور اس کے خدو خال کی دلاویزی کی تصویر نے اس کے دل
میں ہوس کے شیطان کو بیدار کیا۔ جذبہ شہوانیہ کے زیر اثر
وہ وہیں سے واپس ہوا۔ بڑی وحشت خیزی کے ساتھ نئے سرے
سے قبر کھودی تختہ اٹھایا اور قبر میں اتر گیا۔

اس بار خلاف معمول وہ قبر میں دیر تک رکا رہا۔ اور جب

بکلا تو جیسے خون و دہشت نے اس کے لہو کو چوڑ لیا ہو۔ عالم وحشت
میں جیسے تیسے قبر کی مٹی برابر کی پھر افتاں و خیزاں ایک طرف کو بھاگ
بکلا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں کفن بھی نہیں تھا۔ آنکھیں ساون
بھادوں بنی ہوئی تھیں۔ خوف و ہراس کے عالم میں اسے کسی جائے
پناہ کی ضرورت تھی اپنے درد کے درماں کے لئے وہ کس جا میں جا تا تک
پہنچنے کے لئے بے قرار تھا مگر اس کی قوت فیصلہ جواب دے چکی
تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے سے

گیلے کاغذ کی طرح زندگی ٹھہری اس کی
کوئی لکھتا بھی نہیں کوئی جھلاتا بھی نہیں

خوش بختیوں کے اُجالے میں بھیگی ہوئی پیلکوں کے ساتھ ایک دن
فاروق اعظم آقائے کائنات مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم کی بارگاہِ رحمت میں حاضر ہوئے۔

عمر! سببِ گریہ کیا ہے؟

یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! دُراقدس پر ایک
نوجوان کھڑا رہا ہے اس کے گریہ و زاری آہ و فغاں اور تپینے
سوزاں سے دل پھٹا جا رہا ہے۔ وہ اندر آنا تو چاہ رہا ہے مگر ہمت
نہیں کر پا رہا ہے۔

آتشِ تردستی نے دل کے کیا کیا کیا

خضریٰ جاں بوجلا دو ماہیان سوختے

عمر! اسے اندر بلاؤ!

نوجوان نے لرزتے کانپتے کاشانہ نبوت میں قدم رکھا۔

اللہ کے بندے اس قدر گریہ و زاری کیوں۔

یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں ایک سید کا
بدکار اور بہت بڑا گناہگار و مجرم ہوں اپنی گناہوں کی کثرت سے
خوف زدہ ہوں کہ کیا خدائے ذوالجلال مجھ جیسے مجرم کو بھی بخشے گا؟
دلِ عبثِ خوف سے پتہ سا اڑا جاتا ہے

پلہ ہلکا ہی بھاری ہے بھر دس تیرا

اے نوجوان کیا تم نے شرک یعنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود مان
لیا ہے؟

نہیں یا رسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

کیا تم نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہے ؟

ہرگز نہیں اے اللہ کے حبیب !

تو سن لے اے نوجوان ! اگر تیرے گناہ ساتوں آسمانوں، زمینوں
سارے پہاڑوں کے بھی برابر ہوں تو خدائے ذوالجلال اسے اپنے
فضل و رحمت سے بخندے گا

بد سہی چور سہی مجرم و ناکارہ سہی

اے وہ کیسا ہی سہی ہے تو کریم تیرا

یا رسول اللہ میرے گناہ ساتوں آسمانوں، زمینوں اور سارے پہاڑوں
سے بھی بڑے ہیں۔

تیرے گناہ بڑے ہیں یا کرسی ؟

میرے گناہ کرسی سے بھی بڑے ہیں۔

تیرے گناہ بڑے ہیں یا عرش الہی ؟

میرے گناہ ! یا رسول اللہ

تیرے گناہ بڑے ہیں یا خدائے ذوالجلال ؟

ہیں نہیں اے میرے آقا خدائے ذوالجلال تو بہت عظیم ہے۔

بے شک جرم عظیم کو رب عظیم ہی معاف فرماتا ہے

ایک میں کیا میرے عصیاں کی حقیقت کتنی

مجھ سے سولاک کو کافی ہے اشارا تیسرا

اے نوجوان اپنے گناہوں کو بیان کرو !

یا رسول اللہ شرم و ندامت سے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پا رہا

ہوں کہ سرکار کے حضور لب کشائی کر سکوں۔

کوئی بات نہیں تم کچھ توبتاؤ
 یارسول اللہ میں ایک کفن چور ہوں اور سات برس سے
 یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔ جوں ہی کوئی آدمی انتقال کرتا ہے تو
 دفن کے لیے ساتھ ہی میں جنازے کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ اور
 بڑی خاموشی کے ساتھ اس تازہ قبر کو اپنے نگاہوں میں رکھ
 لیتا ہوں اور پھر جب رات ہوتی ہے تو میں وہاں پہنچ کر قبر کھود
 کر میت کے جسم سے کفن اتار کر لے آتا ہوں جسے بیچ کر میں اپنی
 روزی روٹی حاصل کرتا ہوں۔

چند دنوں پیش انصاری کی ایک لڑکی کا انتقال ہوا۔ روات
 دیرینہ کے مطابق رات کے سناٹے میں اس کی قبر پر پہنچ گیا۔
 بڑی احتیاط سے قبر کھودی تھو علیحدہ کیا اور میت کی نعش سے کفن
 اتار لیا پھر قبر برابر کیا اور واپسی کے لئے چل پڑا۔

وہ لڑکی اپنی زندگی میں بڑی خوبصورت تھی واپسی میں اس
 کے برہنہ جسم کے تصور نے میرے اندر کے شیطان کو بیدار کر دیا اور
 دیکھتے ہی دیکھتے میرے اوپر ہوس کا شیطان مسلط ہو گیا۔ میں
 راستے ہی سے واپس ہوا۔ قبر کھودی اور اس کے اندر اتر کر اس
 نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش سے مباشرت کی۔ میں مباشرت سے
 فارغ ہو کر جوں ہی چلنے لگا۔ یارسول اللہ وہ مردہ لڑکی قبر میں اٹھ
 کر کھڑی ہو گئی اور قہر و غضب کے عالم میں کہنے لگی۔ خدائے غارت
 کرے ایک مردہ جسم کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی اور
 تو اس خدائے قہار و جبار کے غضب سے بھی نہیں ڈرا جو ہر مظلوم کو ظالم سے

اس کا حق دلاتی ہے پہلے تو نے مجھے مردوں کی جماعت میں نہنگا کر کے تشریف لیا اور جب میں بارگاہ الہی میں پیش ہو چکی تھی تو ایسے عالم میں تو نے مجھے ناپاک کیا۔

اتنا سنا تھا کہ آتش غضب نے رخسار رحمت عالم کو سرخ کر دیا اور عالم غضب میں فرمایا او بد بخت ہٹ جانظروں کے سامنے سے۔ تو۔ تو نارِ جہنم کا مستحق ہے۔

غضب سے ان کے خدا بچائے جلال باری عتاب میں ہے
امید کی مدھم سی جو لو تھی وہ بھی بھگ گئی اب دنیا اس کی بنگا ہوں میں
تاریک ہو گئی۔ اس کی آخری آس یا س میں بدل گئی۔ خوفِ آخرت
اور غضبِ الہی سے لرزاں و ترساں تو پہلے ہی سے تھا۔ اب اس
میں اور اضافہ ہو گیا۔

بے قرار دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ الحاج و زاری
آہ و فغاں اور توبہ و استغفار کرتا ہوا صبح کی طرف نکل گیا۔ اور
سلسل چالیس دن تک روتا بلکنا اور توبہ و استغفار کرتا رہا۔
اکتالیسویں دن برستی ہوئی آنکھوں اور دل روز آہوں کے ساتھ
آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بارگاہ الہی میں عرض کرنے لگا۔ اے محمد
ابراہیم اور آدم کے رب اگر تو نے میرے گناہ بخش دیے ہیں تو اس
کی اطلاع اپنے پیارے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیدے اور
اگر نہیں بخشا ہے تو پھر آسمان سے ایک آگ بھیج دے جو میرے وجود کو
جلا کر خاکستر کر دے تاکہ میں جہنم کی آگ سے بچ جاؤں۔ بالآخر اس کے پر خلوص
توبہ و ندامت اور گریہ و زاری نے رحمتِ الہی کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا

مکین سدرہ سید الملائکہ حضرت جبریل امین بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے
 یا رسول اللہ آپ کو آپ کا رب سلام پیش فرما رہا ہے اور ساتھ
 ہی دریافت فرما رہا ہے کہ اے محبوب مخلوق کو کس نے پیدا کیا ہے؟ آیا
 تو نے یا میں نے!

اے جبریل تمام مخلوق کو میرے پاک و بے نیاز رب نے پیدا فرمایا
 ہے اور ہی جسلمہ مخلوقات اپنے فضل و رحمت سے رزق بھی عطا فرماتا
 ہے۔ تو پھر یا رسول اللہ اس گنہ گار نوجوان کو بلا کر خوشخبری سنا دیں
 کہ اس کے رب نے اس کی خطا کو معاف کر دیا ہے اور اس کے توبہ
 کو قبول فرمایا ہے۔

ایں درگہ ماورگہ نا امیدی نیست
 صد بار اگر توبہ شکتی باز آ

وہذا استفاد من مکاشفۃ القلوب للامام الغزالی
 اللہ اتنا بڑا مجرم بخش دیا گیا۔ تو ہم گنہ گاروں کو چاہئے کہ اللہ
 کی بارگاہ رحمت میں سچے دل سے توبہ کریں اور اس کی بارگاہ سے
 مایوس نہ ہوں۔

ہم تو ماہل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
 راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

جہانِ حیرت

بریلی کے جواب نے علمائے رامپور کو ایک نئی صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ سرآمد روزگار علماء میں فکر و تشویش کی ایک لہر تازہ دوڑ گئی۔ ریاست رامپور کے والی نواب کلب علی خاں کے استغناء کا یادگار سلف حضرت مولانا ارشاد احمد مجددی نے جواب لکھا جس کی تصدیق رامپور کے مشائیر علماء نے فرمائی۔

بریلی میں خاتم المحققین حضرت مولانا نقی علی خاں کے علم و فضل کا شہرہ بلند تھا اس فتویٰ پر آپ کے دستخط کے حصول کے لیے وہ بریلی بھیجا گیا۔ خلاف اُمید بریلی کے تحقیقی جواب نے ان حضرات کے علم و تحقیق کی بساط ہی الٹ دی۔

دستی جواب لانے والے کو بلایا گیا۔ یہ جواب جو تم بریلی سے لائے ہو یہ خود مولانا نقی علی خاں صاحب کا لکھا ہوا تو نہیں ہے۔ کسی گنہگار آدمی نے لکھا ہے۔ البتہ ان کی تصدیق ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ آیا مولانا نے اس جواب کو یوں ہی سرسری نگاہ ڈال کر دستخط کیا تھا یا بہت غور سے پڑھا تھا پھر دستخط کیا ؟

حضور والا انھوں نے اس فتوے کو دیکھا پھر جا کر دستخط کیا اور ہر لگائی۔

صورتِ حال کی تفصیل بیان کرو ؟

جب میں رامپور سے یہ لفافہ لے کر مولانا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور انھیں پیش کیا تو آپ نے ایک نظر دیکھ کر فرمایا کہ بازو کے کمرے میں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہیں انھیں کو لے جا کر دے دو جو کچھ لکھنا ہو گا لکھ دیں گے۔ آپ کی نشاندہی پر جب میں اس کمرے میں پہنچا تو وہاں کسی مولوی صاحب کو نہ پا کر پھر واپس مولانا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا حضور عالی اس کمرے میں تو کوئی مولوی صاحب نہیں ہیں البتہ ایک صاحبزادے تشریف فرما ہیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا ہاں ہاں بھائی وہی صاحبزادے ہی مولوی صاحب ہیں آج کل اس طرح کا کام وہی کرتے ہیں۔

چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے جا کر یہ لفافہ انھیں پیش کیا انھوں نے اسے کھول کر ایک نظر دیکھا پھر کہنے لگے اگر آپ کو فوری جواب کی ضرورت ہے تو کچھ دیر ٹھہرنا پڑے گا۔ آپ باہر چل کر اطمینان سے بیٹھے میں آپ کو بلاؤں گا۔

کافی دیر بعد وہ کمرے سے نکلے اور جو کچھ انھوں نے لکھا تھا اسے مولانا تقی علی خاں کو پیش کیا۔ آپ نے کافی غور و خوض سے اسے ملاحظہ فرمایا اس کے بعد دستخط کر کے مہر لگانے لگے۔ لفافے میں بند کر کے مجھے دیا میں نے ویسے ہی آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہوں! تو گویا کہ ایک طرح سے یہ انھیں کا فتویٰ ہے۔

جواب لکھنے والے نے یادگار سلف حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب قلد کی کوہ پیکر شخصیت سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بات کا بھی احسان نہیں کیا کہ ان کی حمایت و تصدیق میں سرآمد علماء کی بڑی تعداد میں

دستخطیں و مہر میں مثبت ہیں۔

اسے بھائی کسی مسئلے میں علماء کا اختلاف یہ کوئی نئی بات نہیں۔
تحقیقات علیہ کا دروازہ نہ کل بند تھا اور نہ آج ہی بند ہے۔ اس میں
بغیر کسی ترمیم و تفسیح کے بعینہ یہ فتویٰ نواب تک پہنچنا چاہئے۔ آخر وہ
بھی صاحب علم و فضل ہے خانوادہ خیر آبادی سے نسبت تلمذ کا فخر
حاصل ہے۔ دونوں فتوؤں میں جو واضح فرق ہے اسے وہ بھی تو
محسوس کرے گا۔ ان میں کے ایک سنجیدہ عالم نے مشورہ دیا۔ چنانچہ
کافی تامل اور غور و فکر کے بعد استفتاء اور دونوں جوابوں کو نواب کے
حضور پیش کر دیا گیا۔

نواب صاحب نے بڑے غور سے پہلے مولانا مجددی صاحب کے
جواب کو ملاحظہ فرمایا۔ ساتھ ہی معاصر علمائے رامپور کے تصدیقات پر
بھی نظر ڈالی اور ایک آسودہ سانس لی۔

مگر جب اس نے بریلی کا جواب پڑھنا شروع کیا تو اس کے
پیشانی پر بل پڑنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں جواب پڑھتا گیا حیرت و
استعجاب بڑھتا گیا اور جب پورا جواب پڑھ چکا تو حیرت نے اضطراب
کی شکل اختیار کر لی۔ فوراً خادم خاص کو آواز دی مولانا ارشاد احمد
صاحب کو سلام پیش کرو اور تشریف آوری کے لیے عرض کرو۔

طیب عشق سے پوچھا زلیخا نے علاج اپنا
کہا واجب ہے تجھ کو صورت یوسف کا دم کرنا۔
استلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ نواب صاحب! بندے کو آپ نے
یاد فرمایا ہے ۹

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خوش آمدید مرحبا اہلاً وسہلاً۔
 نہ ہے نصیب۔ تشریف آوری کی زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔
 کوئی بات نہیں یہ تو آپ کی محبت ہے۔ ویسے بندے کو یاد فرمائی
 کی زحمت کیوں فرمائی گئی؟
 بات کچھ عجیب سی ہو گئی ہے کہتے ہوئے بھی جھجک محسوس
 ہوتی ہے۔

بے تکلف ارشاد فرمائیں ہم جیسے درویشوں کے لئے اتنا تکلف
 کیوں؟

بات کچھ یوں ہے کہ چند دن پہلے میری طرف سے آنجناب کے
 خدمت میں ایک استفتاء ارسال کیا گیا تھا جس کا آپ نے جواب بھی
 مرحمت فرمایا ساتھ ہی جلیل القدر علمائے رامپور کی تصدیقات سے وہ
 فتویٰ مزین بھی تھا۔ مزید تصدیق کے لیے میری خواہش کے مطابق اے
 بریلی بھی بھیجا گیا۔ استفتاء ان کی بلند پایہ شخصیت کی اہمیت کے
 پیش نظر ایسا کیا گیا کہ ان کی جلالت علمی ایک امر مسلم ہے۔

بے شک مولانا تقی علی خاں ایک بے پناہ علمی شخصیت کے
 حامل عالم باعمل اور ایک سچے عاشق رسول بزرگ ہیں ہندستان
 میں ابھی ان جیسے بزرگوں کا دم بہت غنیمت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو
 اسلاف کے سچے یادگار ہیں۔

لیکن حضور والا! وہاں کے جواب نے تو ایک نئی صورت حال
 سے دوچار کر دیا ہے۔ خود ہی ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کہہ کر استفتاء مع جواب آتا

سُننے رکھ دیا۔ استفتاء اور بریلی کے جواب کو حضرت مولانا نے بڑی گہری
نظروں سے ملاحظہ فرمایا۔

پھر ایک آسودہ سانس لیتے ہوئے فرمایا قبلہ نواب صاحب فتویٰ
وہی صحیح ہے جو بریلی سے لکھ کر آیا ہے۔

یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ بڑی حیرت ہو رہی ہے کہیں کس نفس
سے تو نہیں کلام لے رہے ہیں آپ؟

یہ کس نفس نہیں بلکہ فراخ دلی کے ساتھ اظہارِ حقیقت ہے فتویٰ
نویسی مولوی احمد رضا خاں کے نام سے کان آشنا تو نہیں لیکن انہی
بلند پایہ تحقیقاتِ علمی سے انکار ممکن نہیں اس پر مستزاد مولانا نقی علی
خاں سلمہ کی تصدیق نے اس تحقیق کو اعتبار کی اعلیٰ ترین سند عطا
فرمادی ہے۔

لیکن حضور کے جلالتِ ملی کا آفتاب بھی تو اپنی جگہ پر سُلَم
ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس کے بارگاہِ فضل و کمال سے لوگ اپنی
تحقیقات کو اعتبار کی سند سے مزین کریں۔ جس کی علمی عظمتوں شکوہوں
کے سامنے جانے کتنی گردنیں خم ہوں کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اس کی
علمی تحقیق ایک گنام مولوی کے تحقیق سے فروتر ہو۔

قبلہ نواب صاحب! آپ تو ذی علم آدمی ہیں مستزاد برآں
خیر آبادی خانوادے سے نسبت تلمذ کا شرف بھی آپ کو حاصل ہے۔
کیا انسان مرکب من الخطاء والنسیان ایک ٹھوس حقیقت
نہیں میں بھی ایک انسان ہوں خطا چوک مجھ سے بھی ہو سکتی ہے۔

چلے آپ سے چوک ہو گئی..... مگر آپ کے جواب پر تصدیق کے لئے جو یہ نامی گرامی علمائے کرام کے ناموں کی ایک طویل فہرست مع مواہیر ثبت ہے۔ کیا ان سب کے اجتماعی غلطیاں سزا دہوئیں؟ ان حضرات نے دستخط کرتے وقت اپنی تحقیقات و معلومات زیادہ اعتماد میری ذات پر کیا کہ ارشاد احمد مجددی نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ صحیح ہی ہو گا۔ ان سے اجتماعی خطا میری علمی قدر و شہرت پر اعتبار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ جبکہ مولوی احمد رضا سلمہ نے میری شہرت سے زیادہ اپنی ذات پر اعتماد کیا۔ جو کسی بھی ذمہ دار شخصیت کے لئے ناگزیر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے اعتبار کے اس پرانے پیمانے کو توڑ کر تحقیق کی لاج رکھ لی۔ اور اس جرأت اظہار ضرورت پر مولانا تقی علی خاں جیسی بزرگ شخصیت نے حوصلہ افزائی کی مہر لگا دی اور یہی ہونا چاہئے۔

تمہیں جرأت اظہار شوق دی ورنہ
جہاں کیا تھی ہماری کہ آرزو کرتے

حضور والا اس حقیقت پسندانہ جرأت اظہار پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں اپنی کسی چوک کو اور وہ بھی اپنے پھولوں کے مقابلے میں بطیب خاطر قبول کر لیں یہ آپ کی بڑائی ہے۔ آپ کی قدر اور احترام میرے دل میں اور بڑھ گیا۔ مولیٰ عزوجل آپ کے سایہ عاطفت کو تادیر ہم پر سلامت رکھے۔

آپ کے اس فراخ دلانہ انتہائی جرأت مندانہ اظہار حقیقت اور ایک گناہ آدمی کے بلند پایہ تحقیقات کو ایسے انداز میں سند

اعتبار نے میری آتش شوق کو ہوا دیدی ہے کہ ایسی علمی شخصیتوں کے تعارف
اور ان کا نیاز حاصل کیا جائے۔

وحشتیں بڑھتی گئیں میرا جنوں تازہ ہوا
اب کسی کی یاد کی شدت کا اندازہ ہوا

بعد قریبی رشتے دار کے ذریعہ جب تو اب رامپور کا دعوت نامہ مولا نا
احمد رضا خاں کو ملا تو آپ والد محترم کی اجازت سے رامپور تشریف لائے
نوبتے والہانہ پذیرائی کی کسی اور چہرہ زیبا پر آغاز سبزہ دیکھ کر تحیر
خیز مسرت کے ساتھ مرجبا کہا۔ اور بڑی محبت کے ساتھ اپنی پلنگڑی پر
بٹھالیا۔ لوازمات میزبانی کے بعد نواب صاحب نے کہنا شروع کیا۔
ماشاء اللہ، سبحان اللہ! اس کسبی کے عالم میں فقہ میں درک و
دینیات میں جو کمال آپ نے حاصل کر لیا۔ اس پر وقت کی بے کراں
علمی شخصیتوں نے آپ کی تحقیقات علیہ کو اعتبار کی سند بھی مرحمت
فرمادی ہے۔ یہ بہت بڑی بات اور تاریخی نوادرات سے ہے۔

میری خواہش ہے کہ جہاں آپ نے دینیات میں اس درجہ کمال
حاصل کر لیا ہے وہیں معقولات میں بھی ایک انفرادیت قائم کریں۔
آپ کی خوش نجاتی سے مجاہد حریت امام المعقولات حضرت علامہ فضل حق
خیر آبادی کے فضل و کمال کے امین ان کی علمی جلالت کے شاہکار اعظم
خیر آبادی خانوادے کے شمع فروزاں اور معقولات کے امام برحق حضرت
مولانا عبدالحق خیر آبادی کی شمع حیات روشن ہے۔ آپ ان سے منطق
و فلسفہ کی بلند پایہ کتابیں پڑھ لیں تاکہ دینیات کی طرح معقولات میں
بھی آپ کی علمی جلالت کو عظمت و اعتبار کا سند مل جائے۔

ان کی ذات والاصفات سے نسبت تلمذ ہی ایک بڑا اعزاز ہے
ابھی یہ ذکر جمیل چل ہی رہا تھا کہ حسن اتفاق سے اس مجلس خاص میں
حضرت مولانا عبدالحق صاحب تشریف لے آئے۔

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے ترے ہونٹ جن کے ہکٹھے
میر دشت باغ میں ڈورتک کوئی باغ جیسے لگا گئے
زبے نصیب! مرحبا اہلاً وسہلاً بڑے موقع سے قدم رنجہ فرمایا آپ نے۔

اے محقق جلیل، علامہ دہرا محقق عصر، امام الحکمتہ، شمس العلماء، تاج الحکماء حضرت مولانا
عبدالحق خیرآبادی بن مجاہد حیرت امام العقولات حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی دہلی
میں ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی دہلی میں
سررشتہ دار ریڈینٹ جو ام رعایا میں ہرولعزیز حکام و دربار شاہی میں مسزوز
باقدر تھے فرزند ارجمند کی ولادت پر تحائف و ہدایا کے انبار لگ کر لاکھوں روپے
نذرانے میں پیش ہوا۔

ہوش سنبھالا تو باپ کے علمی مجلسوں کا رنگ دیکھا مفتی صدر الدین خاں آزرہ
صدر الصدور دہلی کا دربار علمی کا نظارہ کیا۔ دلی اس وقت بلند پایہ علماء و مشائخ
شعرا، اُدبار کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی ہر چہار جانب اصحاب فضل و کمال کے
سلوت و جبروت کے ڈنگے بج رہے تھے۔ ہر طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔
والد ماجد نے تربیت کے ساتھ ہی تعلیم و تدریس کا سلسلہ ہی شروع
کر دیا۔ ہاتھی و پاکی پر آتے جاتے وقت بھی درس دیتے اور پڑھاتے رہتے۔
سولہ سال کی عمر میں تمام درسیات منقول و معقول سے فارغ التحصیل کر دیا۔ خود نولہ
(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

یہ مولوی احمد رضا سلمہ ہیں مشہور بزرگ مولانا رضا علی خاں کے پوتے مولانا نقی علی خاں بریلوی کے بلند اقبال صاحبزادے جنہوں نے اس کسبی ہی میں دینیات میں بڑا کمال حاصل کر لیا ہے اپنے وقت کے بزرگ ترین علماء اور یگانہ روزگار شخصیتوں نے ان کی علمی جلالت کو خسراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کی بلند پایہ تحقیقات کو اعتبار کی سند سے نوازا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ انہیں معقولات کی اہم اور

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) کا آبائی وطن خیر آباد بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا شاہی دور میں کشتری رہ چکا ہے۔ ہندوستان کے مردم خیز قصبوں کے صفِ اول میں شمار رہا ہے۔ خیر آباد دہلی کی علمی صحبتوں کی عمری ہی میں مرتبہ کمال کو پہنچا دیا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی جب حاشیہ قاضی مبارک لکھ رہے تھے کہ درمیان میں کسی غم سے اٹھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے مولانا عبدالحق (جو ابھی زیر تعلیم تھے) کہیں سے پہنچ گئے۔ علامہ نے جہاں پر قلم روکا تھا وہیں سے آگے اسی بحث کو ایک صفحہ بچھ کر چلے گئے اس وقت آپ کی عمر صرف چودہ سال تھی حضرت علامہ کے دریافت کرنے پر جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور اسے بعینہ باقی رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ داروگیر میں دہلی ہی میں تھے باپ کی گرفتاری پر لکھنؤ پہنچ کر بیرونی کی جزیرہ انڈمان چلے جانے کے بعد کچھ عرصہ خیر آباد ہی رہے پھر نواب ٹونک کی دعوت پر ٹونک چلے گئے دو سال وہیں قیام فرمایا۔ فضل علی لہا اور درس و تدریس کا شہرہ ملک و بیرون ملک تک پھیل چکا تھا طالبان شوق ہر چہار جانب سے کشاں کشاں پہنچ رہے تھے۔ علمی جلالت کا فائدہ سن کر

(باقی اگلے صفحہ پر)

بڑی بڑی کتابیں پڑھا دیں تاکہ منقولات کے ساتھ ہی ساتھ معقولات میں بھی زبردست ملکہ حاصل ہو جائے اور اس میدان میں بھی انکی انفرادیت کا سکہ دلوں پر بیٹھ جائے کہ

ع وہ بھیڑ میں بھی بجائے تو تہنا دکھائی دے

مولانا عبدالحق خیر آبادی جن کی شکوہ علمی اور تبحر کا غلغلہ برصغیر ہند سے نکل کر زور و دراز مالک تک پھیل چکا تھا اور جن کا انھیں احساس بھی تھا۔ اسی احساس برتری کا نتیجہ تھا کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ دنیا میں باکمال حکماء کی تعداد صرف ڈھائی ہے ایک والد مرحوم (یعنی علامہ فضل حق خیر آبادی) دوسرے بحر العلوم فرنگی محلی، مولانا عبد العلی لکنوی۔ اور نصف بندہ عبدالحق جزیرہ اٹمان

گورنمنٹ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لئے خدمات حاصل کر لیں۔ کلکتہ کی ہونا موافقت ثابت ہوئی۔ نواب کلب علی کے بے حد اصرار پر رامپور تشریف لائے نواب نے اٹھا کر دی اختیار کی اور تعظیم و تکریم کا حق ادا کر دیا۔ انیس سال تک رامپور میں حاکم مرافعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ رہے۔ گراں قدر مشاہیر کے علاوہ نواب آئے دن بڑی بڑی رقمیں نذرانے میں پیش کرتا رہا۔ مگر مولانا کے شاہانہ داد و بخش کے لیے یہ سب نا کافی ہوتے۔ شہنشاہ امیر تیمور نے جو خند افغانی علامہ سعد الدین تفتازانی کی کی۔ وہی عزت و توقیر نواب کلب علی نے مولانا کی فرمائی۔ حضرت شاہ بخش اللہ تونسوی سے شرف بیعت حاصل کیا۔ آخر وقت میں والد ماجد کی طرح تصوف کی طرف پوری توجہ مبذول (باقی اگلے صفحہ پر)

(کالا پانی) میں ایام اسیری کے درمیان کسی نے مجاہد حریّت علامہ فضل حق
خیر آبادی سے پوچھا۔

حضور والا! اپنے پیچھے آپ نے ہندوستان میں عظیم
یادگار کے طور پر کیا پھوڑے آئے۔ صرف دو چیزیں! حاشیہ قاضی مبارک
اور عبدالحق۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا اپنے عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے۔
اور ان کے کمالات علمی کے صحیح جانشین۔ بڑے بڑے رؤسا، امراء،
نوابین، راجے بہار راجے آپ کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے اور انہیں
اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کبیدہ خاطر نہ ہو جائیں۔

بڑا نازک تعلق ہے دلوں کا
نہ ہو جائے کوئی خاطر کبیدہ

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) فرمائی۔ خیر آبادی میں ۱۳۳۱ھ شوال المکرم ۱۳۱۶ھ میں داعی اجل کو
لیکھا کہا احاطہ خدمت شیخ سعدی میں اپنے دادا مولانا فضل امام اور استاذ الاساتذہ
علامہ سندیلوی کے پاس مدفون ہوئے۔ مولانا کی رحلت سے نہ صرف صف ماتم
پچھ گئی ملک و بیرون ملک کے اسلامی مدارس پر سوگوار سنا پھا گیا۔ خود خلیفۃ المسلمین
سلطان ترکی نے اپنے مدرسہ اظہر میں ایک ہفتہ تعطیل رکھی اور سوگ سنا یا ملکی و
غیر ملکی اخبارات و رسائل و جرائد مقالات تعزیت اور تعزیت نامے لکھے۔ عالم اسلام
نے آپ کی وصال کو پورا طور پر محسوس کیا ہر طبقے میں آپ کی رحلت پر ایک جاں گسل
خوشی طاری ہو گئی۔ استاذ وقت امیر مینائی نے تاریخ وفات کہی سے

شمس العلا وظلت ہر چوں تیر زابر تیرہ برحبت

بروح مزار امیر بنویس آرام گاہ ایام وقت است (باقی اگلے صفحہ پر)

ایسی صاحبِ کرامت و عظمت ہستی جسے اپنے شخصی عظمتوں، رفعتوں، بلندیوں و علمی و جہالتوں کا نہ صرف احساس بلکہ اس کا پندار بھی ہو۔ بھلا وہ ایک کس و نونیز نوجوان دکھ جس کی منیں ابھی بھیگ ہی رہی ہوں اور چہرے کا سبزہ شباب کی ابتدائی دہلیز کی طرف اشارہ کر رہا ہو، کو خاطر میں لا سکتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) تو صوفی اکابر و اسلاف کے نادر یادگار تھے ایک ذات واحد میں کمالاً غریب و اوصاف عجیبہ کا جمع ہونا مولانا کی ذات بابرکات کا خاصہ تھا بقول لسان الملک ریاض خیر آبادی..... زمانہ تو صورت ظاہری کا معاوضہ ہی نہیں ادا کر سکتا۔ وہ نورانی چہرہ وہ خندہ روئی وہ زندہ دلی وہ سُرِ ایا علم وہ رعب کمال وہ شان ادب وہ فضل و جلال۔ ع تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

وقار و مکتب جراتِ اظہار استغناء نازک مزاجی نوابانہ طہراق، نفاست، تراکت، دریا دلی سیرِ چشمی، حق گوئی، صداقت شاعرانہ سب آپ کی خصوصیات سے ہیں....

دور دراز سے تاہر آپ کی داد و دہش قدر دانی، مہمانی قیمت کا شہرہ سن کر آپ کے پاس آتے۔ اگر کبھی کسی نے اپنی چیز کی قیمت وی مانگی جس حساب عام لوگوں کو دیتا ہے اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ تو فوراً اسے واپس کر دیتے آپ کی زندگی کے بے شمار واقعات بھرے پڑے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر کسی دریا دل با اختیار حکمراں کے دہانے کا نقشہ سامنے آجاتا تھا خود ہی فرماتے تھے میں ہمارا نام سن کر آتے ہیں منہ ماتھا دہم نہیں تو کاہے کو کوئی آئے لوگوں میں یہ چرچا تو ہے کہ نوابوں کے مانند ایک بوریا نشین ملائے مکتبی بھی ایسا ہے جو امر کی طرح دل رکھتا ہے سے

جن کے دم سے تھی شہر کی رونق پ کیا ہوئے وہ کدھر گئے چہرے (انکھ صوفیہ دیکھنے)

نواب کی دلہی کے لیے ایک نگہ غلط انداز ڈالتے ہوئے بڑے سرسری طور پر انتہائی خشک لہجے میں دریافت فرمایا۔ میاں صاحبزادے اب تک منطق میں تم نے کون سی کتاب پڑھی ہے

حضور والا : قاضی مبارک

(حیرت و استعجاب کے ساتھ) کیوں صاحبزادے! کیا تم نے تہذیب پڑھی ہے۔

حضور والا! کیا آپ کے یہاں قاضی مبارک کے بعد تہذیب پڑھانی جاتی ہے؟ اس حاضر جوابی نے بلند پیشانی پر سلوٹوں کو نمایاں کر دیا۔

(بقیہ آگے کا) اب ایسے لوگ کہاں جو اپنے علمی و جاہلت عالمانہ طمطراق اور اپنی عزت نفس کے تحفظ کے لیے بڑی بڑی شخصیتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ آج علماء و اہل علم علماء کی اکثریت نے بھی اپنے علمی پندار اور عالمانہ و جاہت و طمطراق کو اہل ثروت و دولت کے سامنے گروی رکھ دیا ہے اس دور میں اگر کہیں ان کا عکس جیل کسی حد تک ہی سہی نظر آجائے تو اسے بھی نوادرات ہی میں شمار کرنا چاہئے۔ اس دور میں شیخ الاساتذہ رئیس العقین حضرت علامہ عبداللہ احمد قادری کے برادر خور و مکرم محترم محتشم ذوالجود و الفضل و الجاہ و انکرم شمس الحکماء سند العقین حضرت علامہ حکیم محمد نعیم الدین صدیقی گورکھپوری میں (ان کی علمی جلالت عالمانہ طمطراق، استغناء، جرات، اظہار، حق گوئی و صداقت شعاری ان کا علمی فضل و کمال، ان کی نفاست، نزاکت، فطری نازک مزاجی نوابانہ خوبیوں) بہت حد تک حضرت مولانا عبدالحق خیر آبادی کی جھلک ملتی ہے۔

۱۔ فن منطق کی اعلیٰ ترین کتاب۔ ۲۔ فن منطق کی ابتدائی کتاب۔

صاحبزادے اس وقت آپ کا مشغلہ کیا ہے ؟
 درس دیتا ہوں فتویٰ نویسی اور کتابیں لکھتا ہوں۔
 کس موضوع پر لکھتے ہو ؟

” دینی ضرورت کے پیش نظر جس بھی موضوع پر لکھنا پڑ جائے
 ویسے فقہ میرے قلم کا جولا بنگاہ اسلام کے اندر در آئے ہوئے
 فتوں کا استیصال میرا مشغلہ۔ فتنہ عظیم و بایمیت کا رد و قلع
 میرا خاص موضوع ہے۔“

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) آپ کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپ کے
 ایک شاگرد مولانا ابوالبرکات احمد ٹونگی پر الزام لگا دیا گیا۔ وہ مولانا جبریل الحق
 خیر آبادی کے پاس ہی تھے۔ شہر کو تو ال وارنٹ گرفتاری لے کر مولانا کے پاس
 پہنچا۔ جب آپ کو صورت حال معلوم ہوئی۔ تو مولانا نے قہر و جلال کے عالم
 میں کو تو ال کی خوب خبر لی اور ساتھ نواب صاحب کو بھی خوب خوب فوٹا
 کہ اکیسہ کیوں چلا آیا اس کو بھی ساتھ لاتا تو مزہ آجاتا کہ ایک طالب علم پر
 یہ جرأت کیسے کی۔ کو تو ال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس پہنچا اور سامنے
 الفاظ ڈھرا دیا۔ نواب صاحب مولانا کے ناز بردار و قدر والے تھے، لہٰذا کو تو ال
 پر برس پڑے کہ مولانا نے میری توہین نہیں کی۔ بلکہ تو نے کی۔ تو ایسے شخص کے
 پاس گیا ہی کیوں۔ جو نواب کو بھی برا بھلا کہہ سکتا ہے۔ اس توہین کا میرا
 نودمہ داس ہے۔ سچ ہے کہ۔ ع

آئین جواں مرداں حق گوئی دے یا کی
 اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی (بقیہ آگے)

اوة ! تو گویا تم بھی میرے خطی بدایونی کی طرح ہو وہ بھی رات دن ان وہابیوں کے پیچھے ڈنٹنے لے پڑا رہتا ہے۔

حضور والا ! رد وہابیت اگر خطبے تو اس کا باقاعدہ آغاز حضور کے والد گرامی قدر حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی ہی نے فرمایا ہے اور اسمعیل دہلوی کے رد میں ایک معرکہ الآرا کتاب تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ تحریر فرمایا ہے جس میں انبیاء و مرسلین و اولیائے کاظمین کی بارگاہ کے گستاخ و بے ادب کو بڑی ہی دو ٹوک انداز

(بقیہ پھلے صفحہ کا) شوق و حقیقت کا تقاضا ہے کہ بس کہتے جائیے اور خوف طرالت دامن کھینچتا ہے کہ بس رک جائے ورنہ ان کی زندگی بھر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔
 ایک کنکر پھینک کر دیکھو ذراتِ آسمان میں
 کس قدر موجیں اٹھیں گی سینہ بیتاب میں

مولانا صاحب تصانیف بزرگ تھے آپ کی کتابیں داخل نصاب بھی ہیں۔ حاشیہ قاضی مبارک، حاشیہ غلام محیی، حاشیہ حمد اللہ، حاشیہ میرزا احمد، امور عامہ، شرح ہدایۃ الحکمتہ، شرح مسلم الثبوت، شرح کافیہ، شرح سلاسل الکلام، جو اہر عالیہ، رسالہ تحقیق تلازم، زبدۃ الحکمتہ وغیرہ وغیرہ مولانا کے تحریر کا یہ حال ہے کہ شرح کو متن سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ذرا بھی تسلسل بیان میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود شارح ہی ماتن ہے اور یہ کہ متن و شرح نہیں

لے اشارات تاج النور محبت الرسول حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کی طرف ہے یہ آپ کے رفیق دس امام العقولات مجاہدین حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔

محمد وارث جمال قادری (بقیہ آگے)

میں کافر و مرتد و بے دین لکھا ہے۔ اور اسمعیل دہلوی کو قال المرتد
 المرتد کے الفاظ سے یاد کیا ہے اور اس پر شرعی حکم نافذ کرتے ہوئے
 فرمایا۔ قائل این کلام لا طائل از دوائے شرع مبین کافر و بے دین است
 ہرگز مومن و مسلم نیست و حکم او شرعاً قتل و تکفیر است۔ یعنی اس بیہودہ
 کلام کا قائل (اسماعیل دہلوی) شریعتِ غزالی کے نزدیک بے شک کافر و
 مرتد ہے ہرگز مومن و مسلمان نہیں اور اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے
 کہ اس کی گردن مار دی جائے اور اسے کافر قرار دیا جائے اور اس
 حکم شرعی کی تصدیق و تائید دہلی (جو اس وقت عالم میں انتخاب تھا)
 کے سترہ جلیل القدر علماء و مشائخ و محدثین زمانہ نے فرمائیں۔

ارے میاں صاحبزادے! ہمارے مقابلے میں تمہاری حاضر جوابی
 کا حال یہی رہا تو تم پڑھ چکے اور ہم پڑھا چکے۔

حضور والا! اتنی جسارت بجا بھی اس لئے کر سکا ہوں کہ مجھے
 شاگردی کا رشتہ ہی نہیں قائم کرنا ہے۔ کہ آپ کی درگاہ کی حاضر
 میں بسا اوقات اپنے ان بزرگوں کے حق میں (جن کے لیے دل میں بجد
 احترام ہے) ایسے جملے بھی سُنا پڑے گا جس کو عام حالات میں ہم سن ہی
 نہیں سکتے۔

تیرا کمال کہ پاؤں میں دھیریاں ڈالیں
 غزال شوق! کہاں کا اسیر ایسا تھا

(بقیہ آگے کا) نہیں بلکہ مسلسل کتاب ہے۔
 زچ بس گیا ہے ذہن میں ناصر کسی کا روپ
 اب کیا کریں گے پھر کوئی شہکار دیکھ کر

یہ اس شخص کا آغاز شہاب تھا جس کا وجود با مسعود اصحابِ فضل کمال کی تاریخ میں ایک جہانِ حیرت ثابت ہوا۔

کائناتِ ارضی کبھی اہل کمال سے خالی نہیں رہی ارسطو، افلاطون، سقراط، فارابی، البیرونی، ابن سینا، ابن رشد، نیوٹن کپلر، گلیلو، غزالی، رومی، رازی، خیام وغیرہ وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے ذکر سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں اور خود یہ لوگ انسانی تاریخ، تہذیبِ انسانی، انسانی تمدن، انسانی معاشرہ، سیاستِ بینِ فون ارتقاء اور تہذیبِ الاخلاق پر باریں طور پر انداز ہوئے کہ آج تک ان کے نقوش سے تاریخ کے صفحات فروزاں ہیں۔

کچھ نقش تری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سرو ساماں سہی ویراں نہیں ہے

مگر چودھویں صدی ہجری کی ابتداء ہی میں برصغیر ہند سے تاریخ کی سلح پر ایک ایسا نام مطلع انوار بن کرا بھرا جو علماء، فقہار، عفتلار، حکماء، فلاسفہ اور متکلمین کی فہرست میں اپنا بلند نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کر کے گلِ سرسبد بنتا ہے۔

اس کی ذات ستودہ صفات سے علوم و حقائق کے اتنے سوتے پھوٹے جن سے فکر و آگہی کے پر شمعے سیراب ہوئے۔ منقولات و معقولات میں ایسے حیرتناک کارنامے انجام دیے کہ جن کا صر تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ علماء، محققین، فقہار و محدثین کے لئے وہ کعبہ آرزو تو تھے ہی۔ دور جدید کے دانشوروں، فلاسفیوں اور سائنس دانوں کے لیے ان کے پیکرِ علمی کا معقولاتی پہلو کم حیرتناک نہیں تھی

تصنیفات میں نظریہ کشش ثقل، نظریہ اضافیت، نظریہ حرکت زمین
پر جب فاضلانہ بحث کرتے ہوئے اپنا موقف ثابت کرتے ہیں تو
وجدان پکارا اٹھتا ہے کہ یہ

اک دانش نوری اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

اور جب قدیم و جدید فلسفیوں کی طرف رخ کرتے ہوئے فلاسفیوں
اور سائنسدانوں کی تحقیقات و تخلیقات کا ناقدانہ جائزہ لے کر انکی
علمی گرفتیں کرتے ہیں۔ مثلاً ابن سینا، شہرستانی، نظام معزی،
نجم الدین علی ابن محمد القزوی، شمس الدین محمد بن مبارک، میر
بخاری، امام غزالی عبدالرحمن بن احمد الایچی، سعدالدین بن مسعود محمد
تفازانی، نصیر الدین بن جعفر بن محمد طوسی، عبدالقادر بن عمر بیضاوی، ملا
محمد جون پوری، آئینرگ، نیوٹن، البرٹ، آئن اسٹائن وغیرہ
وغیرہ۔ تو ایک منصف مزاج صاحب بصیرت انسان پکارا اٹھتا ہے
ذَلِكْ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ .

جس سمت آگے ہو سکے بٹھا دیتے ہیں

ہندوستان کے مشہور شہر بریلی دروہیل کھنڈ میں اللہ تعالیٰ نے
اس رجل عظیم کو پیدا کیا کہ جس کے علمی کارنامے پر اباب علم و دانش
کی تاریخ حیران ہے۔ آپ نسا پٹھان (دوسف زئی)، مذہب سنی
سلسلہ حنفی، مشربا قادری تھے۔ شہر بریلی کے ایک خوش حال
مستول اور علمی گھرانے میں ۱۰ شوال المکرم ۱۱۲۲ھ مطابق ۱۴۱۴ء
۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔

اے آمدنت باہوش آبادی ما

ذکر بود زمزمہ شادوی ما

آپ کا اسم گرامی محمد تاریخی نام الفت اور مجدد محترم مولانا رضا خان نے احمد رضا رکھا اور اسی نام سے مشہور بھی ہوئے آگے چل کر اپنے نام کے ساتھ بالالتزام بعد المصطفیٰ لکھنا شروع کیا اس نسبت غلامی اور ادائے محبت کو تاحیات برقرار رکھا۔ شروع سخن میں اپنا تخلص رضا اختیار کیا۔ ع

احمد ہندی رضا ابن نقی ابن رضا

علوم عقلیہ و نقلیہ کے تحصیل کا یہ عالم کہ چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن ختم کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں درس نظامی کی مشہور کتاب ہدایۃ النور کی شرح بھی۔ دس سال کی عمر میں مسلم الثبوت پر حاشیہ لکھا۔ چودہ سال کی عمر میں اپنے والد گرامی حضرت مولانا نقی علی خاں صاحب قبلہ سے جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کر کے دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ اسی سال دارالافتاء کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ ۲۲ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ آفتاب شریعت و طریقت حضرت مولانا سید آل رسول مارہروی سے شرف بیعت حاصل کیا۔ اور اسی وقت مرشدِ کامل نے اجازت و خلافت اور توجہ اتحادی سے سرفراز فرمایا۔

۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۷۸ء والد ماجد کے ہمراہ حج بیت اللہ

وزیارت نبوی کے لیے حاضر ہوئے یہی وہ مبارک سفر تھا جس میں آپ کے علم و فضل کا آفتاب پورے طور پر چمکا۔ عرب و عجم

جل و حرم مصر و حجاز بلاد مغرب بالخصوص حرمین طیبین کے بزرگ ترین علماء
مشائخ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور احترام و عقیدت سے اپنی اپنی
گردنیں جھکا کر میں پھر اجازت و خلافت اور سندوں کے حصول کا جلد
بختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسی مبارک سفر میں علماء مکہ معظمہ کی گذارش پر علم غیب سول محرم
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تعلق سے ایک عظیم اور تاریخی کتاب بخاری
عالم میں سائے آٹھ گھنٹوں میں (الدولة المکیة بالمادة الغیبیة) ظم
وجود میں آئی جس نے علماء حرمین طیبین کو انگشت بندن لال کر دیا۔
مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علوم پر ایسے
شہ پارے و گوہر ہائے آبدار سامنے آئے جس نے حرمین طیبین کے جلیل
القدر علماء و مشائخ کو حیرت زدہ کر دیا۔

علمائے حجاز نے جس قدر و منزلت عقیدت و محبت عزت و احترام
کا عظیم الشان مظاہرہ کیا۔ اس کی کوئی دوسری مثال اس عہد
لے کر آج تک دیکھنے اور سُننے میں نہیں آئی۔ جس کا اندازہ مسام
الحرمین، اور الذیولہ المکیہ پر لکھی جانے والی تقریظوں سے ہوتا
ہے۔ اس سفر میں محافظ کتب خانہ حرم حضرت علامہ سید اسماعیل
خلیل مکی نے آپ کو دو دھوین ہدی کے مجتہد کا خطاب دیا۔

”تعمہ فی الدین کا یہ عالم کہ تقریباً بارہ ہزار صفحات پر مشتمل
بارہ ضخیم جلدوں میں فتاویٰ رضویہ علمائے حرم کے استفسار پر
الکفل لفقہ الفاضل فی احکام قرطاس الدرہم (زبان عربی)
دو ضخیم جلدوں جملہ المتار حاشیہ رد المتار (زبان عربی) میں سواد اعظم

اہل سنت و جماعت کو عطا فرما کر اپنی فقہی بصیرت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا جس پر فقہیان اسلام کو حیرت و استعجاب بھی ہے اور فرحت و مسرت بھی۔ عربی زبان میں آپ کے فتاویٰ کے صرف چند پورا پورا دیکھ کر مکہ شریف کے عالم جلیل مولانا سید اسمعیل خلیل بے ساختہ پکار اٹھے۔ وَاللّٰهُ اَقْوَلُ وَالْحَقُّ اَقْوَلُ اِنَّهُ لَوَرَاہَا اَبُو حَنِيفَةَ النِّعْمَانَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ لَا فَرَّتْ عَيْنُهُ وَلَجَعَلَ مَوْلَاهَا مِنْ جَمَلَةِ الْاَحْبَابِ۔ بخدا میں بالکل سچ کہتا ہوں کہ اگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اس فتویٰ کو ملاحظہ فرماتے تو آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور صاحب فتویٰ امیر امام احمد رضا کو اپنے شاگردوں میں شامل کر لیتے۔

یوں تو آپ کی پوری زندگی کا کارناموں سے عبارت ہے ہر لمحہ ہر آن کا کارنامے ہی کا رنلے !

گویا ع ہر آن نیا طور نئی برق تجلے

ہمدانی، ہمہ جہتی، مذہبی، سیاسی، علمی، فقہی اور مجتہدانہ کارنامے جو اپنی وسعت، تنوع، مضامین کی بلندی، جودت فکر اور تعداد کی کثرت کے لحاظ سے ایک پوری ایکڑی کے صد سالہ خدمات پر بھاری ہیں ایک متحرک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا جو کام تھا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے تنہا انجام دے کر اپنی ہمہ گیر و ہمہ صفت جامع و تابندہ شخصیت کے انٹل نقوش پھوڑے وہ کون سا موضوع اور کون سا فن ہے جو اس عجمی الشرق کے رُواں و سیال قلم سے سیراب نہیں ہوا۔

عہ اس طرح کے متعدد تاثرات و واقعات کے لیے میری کتاب اوزار کز الایمان کا مطالعہ کریں۔
محمد وارث جمال قادری

تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت، فرائض، کلام، عقائد، تجوید، تصوف، اذکار، اوقاف اخلاق، تعبیر، تاریخ، سیر، مناقب، فضائل، اسماء الرجال، جرح و تعدیل، نحو، صرف، منطق، ادب، زینت، جبر و مقابله، جفر و تکسیر، مثلث ارشماطی، لوگاتیم، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، حساب، نجوم، توحید، غرض انسانی فضل و کمال کے پیکر مجسم نے جس سمت رخ کر دیا۔ علوم و آگہی اور معارف و حقائق کے چشمے ابلنے لگے۔ یہ ان کی عظیم تر علمیت کی گہرائی و گہرائی ہی تو ہے کہ آج ایشیا سے لیکر یورپ اور افریقہ سے لے کر براعظم امریکہ تک جدید علمی دانشکدے آپ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔

برصغیر ہندو پاک میں پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، جبل یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، افریقہ میں ویل یونیورسٹی، یورپ میں نیوکاسل یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی، لیڈن یونیورسٹی۔ امریکا میں برکلی یونیورسٹی، کولمبیا یونیورسٹی۔ یہ وہ جدید علمی دانش گاہیں ہیں۔ جہاں پر امام احمد رضا بریلوی کے مقولاتی و معقولاتی پہلو پر کسی نہ کسی انداز میں کام ہوا اور ہو رہا ہے۔

بے ہودہ گوئی و ہرزہ سرائی و بدنام کرنے کے تمام قبیح ہتھکنڈوں کے باوجود آپ کے علم و فضل کا آفتاب پورے علمی تہذیب کے ساتھ جگمگا رہا ہے اور کائنات بھر کے دانشوروں کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔

جس قدر ہم نے سیر کی یادوں کے نقوش

دل بہ کتاب نے اتنا ہی تجھے یاد کیا

آپ کے تمام کارناموں میں ایک بڑا کلاماً ترجمہ قرآن پاک کنز الایمان ہے جسے سیدہ مصطفیٰؑ نے ۶۹۱ھ میں رسول میں ڈوب کر علم ادب اور عشق و محبت کا شاہکار بنا دیا۔ جس سے سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی آنکھیں ٹھنڈی ہو کر ملنے اور ایمانیں سیراب ہوئیں ایمان کو تھی علالت اور زبان کو ایک نئی پاشنی ملی اور ساتھ ہی بصد نثار دوشے معنی بھی مجھوم اٹھی۔

ع خندہ گل جنبش لب بوئے گل تقریر ہے

اس شہید محبت اور کشتہ تیغ نگاہ مصطفیٰ نے جس انداز محبت میں آنکھیں بند کر کے یہ ترجمہ محبت! اہل محبت کو دیا ہے۔ وہ داستان محبت بھی بڑی عجیب ہے۔

الٹی ہی پھال چلتے ہیں دیوان گان عشق

آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لئے

تراجم کے ان مجوم میں جو فضیلت و برتری اور شان امتیاز ترجمہ پاک کنز الایمان کو حاصل ہے وہ اہل علم، اہل ذوق، اہل ادب اہل محبت پر اظہار من الشمس ہے۔

کسی بھی زبان کے لب و لہجہ حسن بیان، اسما لیب بلاغت کو جس حد تک ترجمہ میں سمویا جاسکتا ہے۔ عروج کے اس انتہا پر

عہ تفصیل کیلئے سوانح المصنف امام احمد رضا از علامہ سید الدین احمد ضوی۔ چار اہل عرف کی کتاب الفلا کنز الایمان جو ۹ برس پہلے شائع ہو چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ محمد عارف

کنز الایمان کی انفرادیت اپنی مثال آپ ہے۔

یوں تو کہنے کو اردو زبان میں ترجمے بہت ہیں مگر ایسا ترجمہ قرآن جو صرف قرآن سے کیا گیا ہو۔ جو میزان عشق پر نیا تلا ہو۔ جس کے ہر نازک مقام پر ادب و احتیاط، حزم و اتقار، فکر و دانش، حرمت و تعظیم کے ساتھ ہی سرچشمہ محبت ہی محبت ہو۔ وہ صرف مجدد اعظم سیدنا امام احمد رضا بریلوی کا ترجمہ کردہ قرآن مجید (کنز الایمان) ہے۔

جس طرح قرآن کی فصاحت و بلاغت، لسانیات عرب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یوں ہی اردو تراجم میں کنز الایمان اردو ادب کا دژ شاہوار ہے۔ انٹی برس کا طویل عرصہ اردو ادب کو کہاں سے کہاں لے گیا۔ اس عرصے میں نمایاں ترقی کی طرف اردو ادب نے نہ صرف تیزی کا مظاہرہ بلکہ بلندی کی طرف جانے میں جست لگائی ہے بیسویں صدی کے نصف آخر کو اردو ترقی کا دو بعد یہ کہا جاسکتا ہے مگر تقریباً انٹی برس کے بعد آج بھی ترجمہ پاک کنز الایمان اردو زبان و ادب کا نمائندہ و ترجمان بنا ہوا ہے اس ترجمے کی معنوی خوبیاں تو الگ نہیں بلاغت زبان اور حسن ادب کا حال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کل بھی اردو ادب کے ذوق نمود کی علامت بنا ہوا تھا اور آج بھی ہندوستانی ادب کدے کا قیمتی سرمایہ :

جسے فاضل بریلوی کی زندہ کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے

بخدمت عالیٰ اعلیٰ حضرت کے خلیفہ ارشد حضرت محدث اعظم ہند کا ترجمہ پاک معارف القرآن اور حکیم الامت حضرت مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی کے تراجم ماضی قرین میں منظر عام پر آچکے ہیں جو کنز الایمان ہی کے عکس جیسے ہیں اور گونا گوں خوبیوں پر مشتمل۔
ممد و انتظام

تصانیف علامہ عالم فقہری

الحکام حج	اللہ میری توبہ
اذکار و شہ آنی	اللہ سے دوستی
اولیائے پاکستان (اول و دوم)	اللہ کی معرفت
گلزارِ صوفیاء	اللہ کا فیر
آفتابِ زنجبان	منازل ولایت
تذکرہ علی احمد صابر کلیری	غزینہ اخلاق
اقوالِ تصوف	اخلاقِ حسنہ
روحانی عملیات	ہمارا اخلاق
روحانی ڈائری	تزکیۃ العلوب
برکاتِ درود	فقہی وعظ (حصہ اول)
قصص الاولیاء	سستی بہشتی زیور
نماز کی کتاب	سستی فضائل اعمال
روحانی اعتکاف	پہنجامِ مصطفیٰ
اسمِ اعظم	غزینہ درود شریف
فقہی مجموعہ و ظائف	آدابِ سنت
نمازِ حنفی	احکامِ نماز
پیارے رسولؐ کی پیاری دعائیں	طہارت
نمازِ مترجم	زکوٰۃ
	روزہ

ناشر: شبیر برادرز اردو بازار لاہور

تصانیف علامہ عالم فقری

احکام حج	اللہ میری توبہ
اذکارِ فُشْرَ آنی	اللہ سے دوستی
اولیائے پاکستان (اول دوم)	اللہ کی معرفت
گلزارِ صوفیاء	اللہ کا فقیر
آفتابِ زنجبان	منازل ولایت
تذکرہ علی احمد صابر کلیری	خزینہ اخلاق
اقوالِ تصوف	اخلاقِ حَسَنَہ
روحانی عملیات	ہمارا اخلاق
روحانی ڈائری	تزکیۃ القلوب
برکاتِ درود	فقری وعظ (حصہ اول)
قصص الاولیاء	سُنی بہشتی زیور
نماز کی کتاب	سُنی فضائل اعمال
روحانی اعتکاف	پیغامِ مُصطفیٰ
اسمِ اعظم	خزینہ درود شریف
فقری مجموعہ و ظائف	آدابِ سُنت
نمازِ حنفی	احکامِ نماز
پیارے رسول کی پیاری دعائیں	طہارت
نمازِ مترجم	زکوٰۃ
	روزہ

ناشر: شبیر برادرز اردو بازار لاہور

تصانیف علامہ عالم فقہری

الحکام حج	اللہ میری توبہ
اذکار و شہ آنی	اللہ سے دوستی
اولیائے پاکستان (اول و دوم)	اللہ کی معرفت
گلزارِ صوفیاء	اللہ کا فیر
آفتابِ زنجبان	منازل ولایت
تذکرہ علی احمد صابر کلیری	غزینہ اخلاق
اقوالِ تصوف	اخلاقِ حسنہ
روحانی عملیات	ہمارا اخلاق
روحانی ڈائری	تزکیۃ العلوب
برکاتِ درود	فقہی وعظ (حصہ اول)
قصص الاولیاء	سستی بہشتی زیور
نماز کی کتاب	سستی فضائل اعمال
روحانی اعتکاف	پہنجامِ مصطفیٰ
اسمِ اعظم	غزینہ درود شریف
فقہی مجموعہ و ظائف	آدابِ سنت
نمازِ حنفی	احکامِ نماز
پیارے رسولؐ کی پیاری دعائیں	طہارت
نمازِ مترجم	زکوٰۃ
	روزہ

ناشر: شبیر برادرز اردو بازار لاہور